وبھوتی نارائن رائے

شہر میں کرفیو

شہر میں کرفیو

وِبھوتی نارائن رائے

شہر میں کرفیو

(ناول)

مصنف:

وِبھوتی نارائن رائے

مترجم:

وقار ناصری

ناشر

خبر دار پبلیکیشنز

2724/10 میٹرو پول مارکیٹ، عقب موتی محل ریسٹورنٹ دریا گنج، نئی دہلی 110002

نام کتاب : **شہر میں کرفیو**
مصنف : وبھوتی نارائن رائے
مترجم : وقار ناصری
اہتمام : معصوم مرادآبادی
تعداد : 400
ناشر : خبردار پبلی کیشنز 10/2724 میٹروپول مارکیٹ
عقب موتی محل ریسٹورنٹ، دریا گنج، نئی دہلی 110002
طباعت : ایم۔ کے آفسیٹ پرنٹرز، 1397 پہاڑی املی، دہلی۔ 6

ملنے کے پتے

- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ 6
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی-6
- تخلیق کار پبلشرز، 104/B، یادومنزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی - 92
- موڈرن پبلشنگ ہاؤس 9 رگولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-2
- عاکف بک ڈپو، 3243، کوچہ تاراچند، دریا گنج، نئی دہلی-2

SHAHAR MEIN CURFEW Rs. 100.00
By: VIBHUTI NARAIN RAI 2004

KHABARDAR PUBLICATIONS
2724/10, Metropol Market,
Behind Moti Mahal Restaurant ,
Darya Ganj ,NEW DELHI- 110002 Telefax. 23254644

فہرست
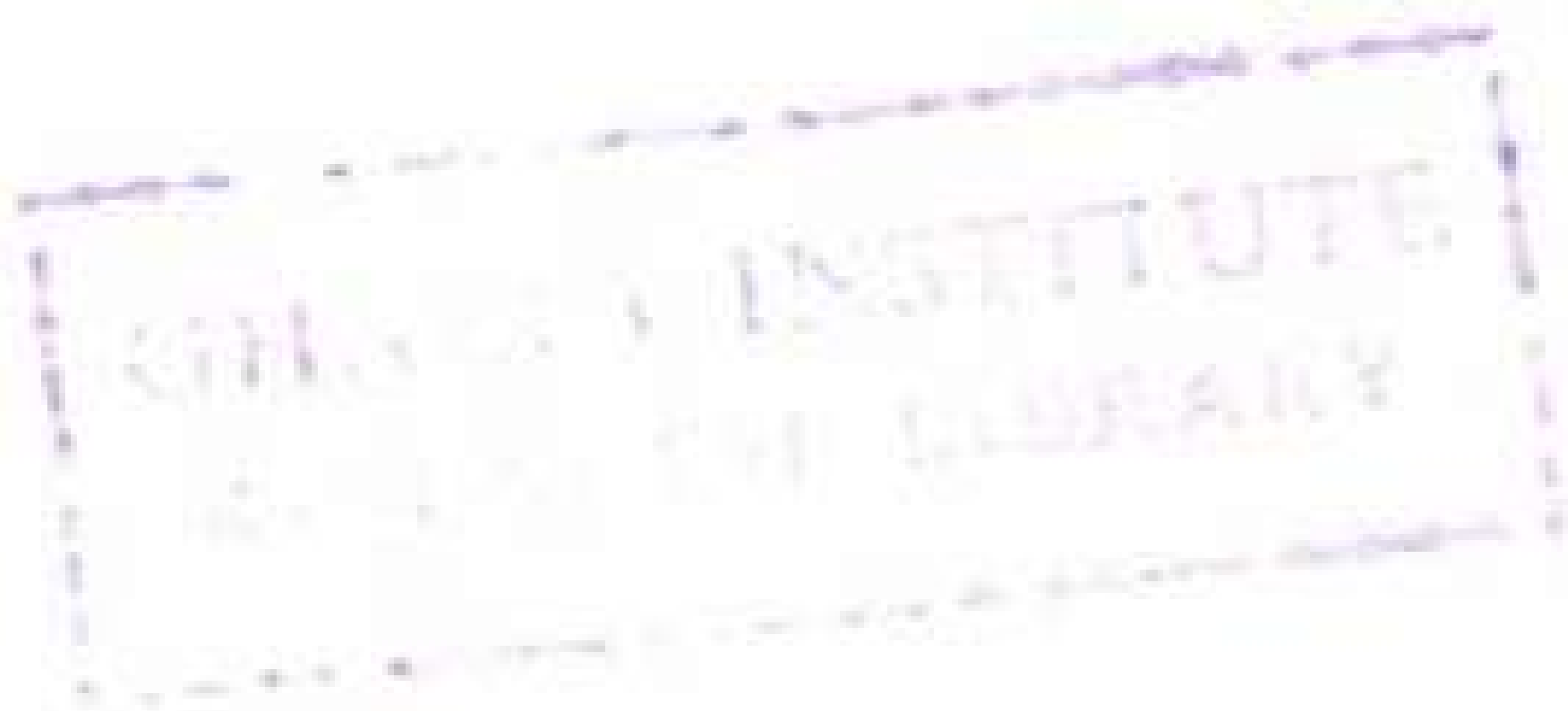
عرض ناشر

''فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس'' کی اشاعت کے بعد جناب وبھوتی نارائن رائے کی یہ دوسری کتاب اردو میں شائع کرنے کا اعزاز ہمیں حاصل ہورہا ہے۔ اس شہرہ آفاق ناول میں جناب وبھوتی نارائن رائے نے سماج کے ایک ایسے طبقے کے درد اور کرب کو زبان دی ہے، جسے تعصب اور تنگ نظری نے ہمیشہ دبائے رکھا۔ یہ ناول کرفیو کے دوران سماج کے کمزور اور مجبور لوگوں کی بے بسی اور لاچاری کا ایسا دلدوز منظر پیش کرتا ہے، جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس ناول میں فساد بھڑکانے اور اس کا سیاسی استحصال کرنے والے عناصر کو پوری جرأت اور بے باکی کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔ فساد کے دوران امن قائم کرنے کے نام پر پولیس فورس مظلوموں کے ساتھ جبر واستبداد اور تعصب کا جو سلوک روا رکھتی ہے اسے خود اسی محکمے کے ایک اعلیٰ افسر نے فکشن کی زبان میں بڑی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ اس لیے اس ناول کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔

'شہر میں کرفیو' کی اشاعت سب سے پہلے ہندی میں ہوئی تھی۔ بعد ازاں اس کا ترجمہ انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں میں ہوچکا ہے۔ زیرنظر اردو ترجمہ جناب وقار ناصری نے کیا ہے۔ رائے صاحب نے ''شہر میں کرفیو'' کا اردو مسودہ میرے حوالے کیا تو اسے کتابی صورت میں پیش کرنے سے قبل کچھ اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس مقبول عام ناول کو اردو قارئین کے سپرد کرتے ہوئے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس میں دو کارآمد اضافے کیے گئے ہیں۔ میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب کا ممنون ہوں، جنہوں نے اس ناول پر بسیط مقدمہ لکھنے کی درخواست قبول کی۔ رائے صاحب نے 'پس نوشت' کے طور پر جو مسودہ انگریزی میں سونپا اس کے ترجمہ کی ذمہ داری صحافی برادرم اشہر ہاشمی نے انجام دی۔ اس طرح یہ ناول ایک نئے انداز میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی طباعت اور تزئین کے معیار کو قائم رکھنے کی جو کوشش کی گئی ہے، اس میں ہمیں کہاں تک کامیابی ملی ہے اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

— معصوم مرادآبادی

ناشر ومرتب

مقدمہ

دوستوں میں رائے صاحب کے طور پر جانا جانے والا یہ شخص جس کا نام وبھوتی نارائن رائے ہے، ادھیڑ عمر کا ایک سیدھا سچا، حوصلہ مند اور منصب آگاہ پولیس افسر ہے۔ رائے صاحب کو میں پچھلے تقریباً دس برس سے ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ ایک مرنجاں مرنج، متین، بہ ظاہر غیر جذباتی، دوستوں کے دوست قسم کے انسان ہیں۔ ایک اعلا منصب پر فائز ہونے کے باوجود ان میں کسی طرح کا تصنع، طمطراق اور دکھاوا نہیں ہے۔ پتہ نہیں یہ پورب دیس کی مٹی کا اثر ہے یا ایک سوچے سمجھے انسان دوستانہ تصور کے مطابق شخصیت کی تراش خراش کا نتیجہ، کہ رائے صاحب میں پولیس والوں کی سنگینی، سخت کوشی اور چالاکی کا کوئی رنگ نہیں۔ وہ ایک سادہ مزاج، بڑی حد تک بھولے بھالے، صاف گو، کھرے اور دیانت دار انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ایک وسیع المشرب تصور حیات میں یقین اور ایک منصفانہ اجتماعی زندگی پر اعتماد کے باوجود، اپنے عام انداز سے وہ کبھی پُر جوش اور شدت پسند نظر نہیں آتے۔ یہ زندگی کا ایک مشکل اور صبر آزما اسلوب ہے۔

خاص طور پر ہمارے اپنے زمانے اور گردو پیش کی دنیا کے حساب سے، جو سنگ دلی، درد اور دہشت کے ایک مسلسل تماشے میں گھری ہوئی ہے، رائے صاحب کی جیسی شانت سبھاؤ والی زندگی گزارنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اپنی ہستی اور اپنے عہد کا سارا طوفان انھوں نے اپنے سینے میں چھپا رکھا

ہے۔ ان کے نرم آثار چہرے، گھریلو انداز اور اپنائیت سے بھرے ہوئے لہجے، قدرے بڑی اور شفاف آنکھوں میں اداسی کی ایک جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے، لیکن رائے صاحب کی شخصیت میں ضبط اور ٹھہراؤ بہت ہے۔ انتہائی سخت اور مشکل حالات میں بھی وہ گھبرائے ہوئے، سراسیمہ اور پُرشور نظر نہیں آتے۔

قدروں کے زوال اور انسانی جذبوں اور احساسات کے انتشار کا یہ عہد جس میں شور بہت ہے، تشدد بہت ہے، زبان، مذہب، مسلک، قبیلے، علاقے اور آئڈیالوجی کے نام پر بٹوارے اور دوریاں بہت ہیں، ایسے ماحول میں رائے صاحب کا وجود کچھ خاص معنیٰ رکھتا ہے، اپنی انسانی حیثیت اور ادبی حیثیت، دونوں کے لحاظ سے زمانے کی ہوا اور زندگی کے عام چلن کے مطابق نہ تو ان کی شخصیت مڑتی ہے، نہ تحریر۔ ان کی ادبی حسیت زمانے کو اور زندگی کو اس اجتماعی زاویے کے مطابق موڑنا چاہتی ہے جس سے ہماری اجتماعی نجات کا راستہ نکلتا ہے۔

جارج آرول نے کہا تھا۔ ''جنگ کے زمانے کا ادب صحافت ہوتی ہے۔ گویا کہ ادب کے محاسن صرف زبان و بیان اور اسلوب و اظہار کے مضمرات میں نہیں ڈھونڈے جاتے۔ ہر دور کی زندگی کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں، عام انسانوں سے بھی اور ادیبوں فن کاروں سے بھی۔ جس طرح کے ماحول سے اس وقت ہم دوچار ہیں، اس میں زندگی کے ساتھ ادب کے معنی بھی بدل چکے ہیں۔ اس وقت ہماری دنیا جن حالات میں گھری ہوئی ہے اور جس طرح کے سوال اسے درپیش ہیں، ان سے بے نیاز رہ کر ہم نہ تو اپنی انسانیت کو محفوظ رکھ سکتے ہیں، نہ اپنی ادبیت کو۔ سوال صرف دنیا کو سمجھنے کا نہیں، بہ قول سارتر اسے بہتر بنانے اور بدلنے کا بھی ہے۔ اس مسئلے نے اور موجودہ انسانی صورت حال نے ہمارے زمانے میں اتنی سنگین شکل اختیار کرلی ہے کہ ہم اجتماعی زندگی کی تفہیم وتعبیر کا کام اب صرف سیاست دانوں کے سپرد نہیں کرسکتے۔

ان حالات میں ادیب کرے کیا؟ بے شک آج کے صارفی معاشرے میں

ادیب اور ادب حاشیے پر ہیں۔ کس نمی پُرسد کہ بھیا کیستی؟ ادیب اور آرٹسٹ کو ایک فالتو اور غیر ضروری قسم کے آدمی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے پاس کوئی فورم نہیں۔ کوئی محاذ نہیں۔ ایسے وسائل نہیں کہ اجتماعی زندگی میں وہ کوئی نمایاں اور اہم رول ادا کرسکے۔ لیکن انسانی تاریخ میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں جب عام ذہنی زندگی پر آرٹ اور ادب کے اثر انداز ہونے کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اصل فرانسیسی انقلاب (1789ء) سے پہلے تصورات کی دنیا میں ایک انقلاب آچکا تھا۔ آمر اور مطلق العنان اور بہ ظاہر طاقت ور حکومتیں اسی لیے اُن لوگوں سے خوف زدہ رہتی ہیں جو خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ احتساب، سنسرشپ، زبان اور قلم کا ایک طے شدہ رخ متعین کرنے کی کوششیں اور طرح طرح کے بدصورت قوانین اور پابندیاں، ہر زمانے میں ادب اور آرٹ کے لیے مشکلات پیدا کرتے رہے ہیں۔ خود ہمارا معاشرہ اس وقت جس صورت حال کا شکار ہے، جمہوری قدروں کی جس طرح پامالی ہورہی ہے، فاشزم جس تیزی سے بڑھ رہا ہے، تقریباً تمام قوموں میں مذہبی جنون جتنی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے اور انسانی معاشرہ مسلک، فرقے، زبان، نظریے، علاقے کے نام پر جس طرح تقسیم ہورہا ہے اس پس منظر میں کسی بھی لکھنے والے کے لیے اپنے حواس کو مجتمع رکھنا آسان نہیں۔ حساس روحوں کے لیے لاتعلق اور غیر جانبدار رہنا بھی خارج از امکان ہے۔ پھر ایک ایسا شخص جو خیر سے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری اجتماعی زندگی کے سب سے سنگین مسئلے فرقہ واریت سے نمٹنے کا محض اخلاقی طور پر نہیں بلکہ منصبی طور پر بھی پابند ہو، اس کے لیے اس طرح کی صورت حال میں اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھنا، اس مسئلے سے براہ راست الجھنا اور اسے حل کرنے کی عملی تدابیر اختیار کرنا تو اور بھی دقت طلب ہے۔ گویا کہ وبھوتی نارائن رائے کو اپنی قومی زندگی میں جو رول ادا کرنے کا مرحلہ درپیش ہے اس کی جہتیں بیک وقت فکری و تخلیقی بھی ہیں، معاشرتی اور طبعی بھی۔ یوں آج کے زمانے میں

اس حقیقت سے کسی بھی ادیب کا آنکھیں چرانا ممکن نہیں رہا۔ گرچہ بے اساس اصولوں اور ادبی نظریوں سے شغف رکھنے والے، ادب اور ادیب کے ایسے کسی رول میں یقین نہیں رکھتے جو ادب کو زندگی کے ہنگاموں میں گم کرسکتا ہو۔ سارتر نے ایک موقع پر کہا تھا کہ جو لوگ ادب سے جیتی جاگتی انسانی حقیقتوں کے اخراج کا دعوا کرتے ہیں، صرف ادب کی مابعد الطبیعات کا تصور سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ادب کے سماجی مقاصد کی مخالفت کرتے ہیں، ان سے میں تو صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ادب میں مقصد کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا۔ آپ زمان ومکاں کے سیاق میں کسی بھی انسانی قدر، تصور، تجربے کی بات کریں، بالآخر ادب کی سماجی جہت سامنے آجائے گی۔ اسی لیے تو یہ خیال شاید چاروناچار قبول کرنا ہی پڑے گا کہ انسانی تجربات اور تصورات کی گفتگو کسی نہ کسی سطح پر سیاست کے دائرے میں داخل ہو ہی جاتی ہے۔

اردو اور ہندی سمیت، ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں میں اس وقت جو فکشن لکھا جارہا ہے، وہ اس عہد کی تاریخ کے بنیادی حوالے کو مسترد نہیں کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہر ادیب تاریخ کے پھیر میں پڑنے اور اس پھیر سے نکلنے کا اپنا الگ انداز رکھتا ہے۔ وبھوتی نارائن رائے نے ''شہر میں کرفیو'' کا تانا بانا جس شخصی اور اجتماعی سچائی کے گرد بُنا ہے اس کے تمام نقوش اور لکیریں ہمارے سامنے کی ہیں۔ تخلیقی تجربے اور ادیب کی آزادی کے نام پر انھوں نے اپنے اور اس عہد کے گرد پھیلے ہوئے تاریخ کے حصار کو توڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ ''شہر میں کرفیو'' ایک طرح کی وابستہ، کمیٹڈ (Committed) اور ENGAGED تخلیق ہے۔ وبھوتی نارائن رائے نے ہندوستانی پولیس کی کارکردگی اور ہندو مسلم فسادات میں پولیس کے رول سے اپنی عملی اور براہ راست واقفیت کے باعث اس ناول کو ایک واضح دستاویزی بنیاد بھی عطا کی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت دوٹوک، کھرا اور پھیلا ہوا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے اپنی جذباتی ترجیحات کے بوجھ سے اپنے

ادراک اور مشاہدے کو بچانے کے لیے کتنی جدو جہد کی، کی بھی یا نہیں؟ اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بیان میں حسّی مساوات کی وہ کیفیت جو اس مختصر ناول کی تمام تر سطح پر حاوی ہے، وبھوتی نارائن رائے کے یہاں بغیر کسی شعوری کاوش کے، ان کی فطری دیانت داری اور شخصیت کے کھرے پن کی وجہ سے خود بخود پیدا ہوگئی ہو۔ بہر حال، اتنا طے ہے کہ ہندو مسلم فسادات جیسے آتش فشاں اور پیچیدہ موضوع پر ''شہر میں کرفیو'' کی قسم کا ناول لکھنا آج آسان نہیں ہے۔

1947ء کے فوراً بعد تقسیم اور فسادات کے ماحول میں جو بھیانک انسانی تماشا سامنے آیا تھا اور جس کی روداد سے ہمارا فکشن بھرا پڑا ہے، اس میں اور ''شہر میں کرفیو'' میں ایک بنیادی فرق ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں ہماری تاریخ، معاشرت، سیاست اور اجتماعی رویوں کے محور بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوئے ہیں۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کی سرگرمی نے اس تمام منظرنامے کی مخفی ترین اور بعید ترین طبیعی اساس تک رسائی کا سامان مہیا کردیا ہے۔ مختلف فرقوں اور قومیتوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت وقت کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی سے فوراً بعد کے ادوار میں ہندو مسلم تعلقات کی سطحیں اور نوعیتیں آج کے دور کی بہ نسبت بہت مختلف تھیں۔ فرقہ وارانہ سیاست نے، تہذیبی اور معاشرتی تغیرات نے، ہمارے جذباتی تعلقات کی دنیا ہی تہس نہس کرکے رکھ دی ہے۔ ماضی کی طرف ہمارے رویوں کو بدلنے کی جو منظم کوششیں فرقہ پرست جماعتوں کی طرف سے ہورہی ہیں تو اسی لیے کہ ہم میں کچھ بھی مشترک نہ رہ جائے۔ ہماری اجتماعی تاریخ میں آج کی جیسی صورت حال شاید پہلے کبھی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کے پیش نظر فسادات کو فکشن کی بنیاد بنانا اور اپنے فکشن کو حقیقت پسندی کی اس روایت کا حصہ بنانا جس کی داغ بیل پریم چند کے ہاتھوں پڑی تھی، آسان نہیں تھا۔ فسادات کا جو ادبی سرمایہ اردو فکشن کی روایت میں منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور ان کے چھوٹے بڑے معاصرین کے توسط سے سامنے آیا، وبھوتی نارائن رائے کا یہ

ناول اس سے ایک الگ پہچان بناتا ہے۔تاریخی اور معاشرتی سیاق کی تبدیلی نے اس ناول کو ایک علاحدہ شناخت عطا کی ہے۔

وبھوتی نراین رائے نے اس ناول میں ایک فکشن نگار کے ساتھ ساتھ ایک مشاہد، ایک سماجی مبصر ایک نقاد کے رول بھی ادا کیے ہیں اور اپنے ہر رول میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ان کی اس تخلیق کا خطاب صرف ادب کے قاری سے نہیں ہے۔انھوں نے ہمارے زمانے کی معاشرت، سیاست اور ہماری اجتماعی زندگی کی قیادت کرنے والے ان تمام لوگوں سے مکالمہ قائم کیا ہے جن کے ہونے سے یہ زندگی داغ دار دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ یہ چھوٹی سی کہانی ایک آئینہ بھی ہے جس کی اپنی سطح تو بہت شفاف ہے، لیکن اس سطح سے جھانکتے ہوئے عکس کو دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔یہ کہانی نہ تو صرف وقت گزاری کے لیے پڑھی جاسکتی ہے، نہ تفریحاً۔وبھوتی نراین رائے نے اس کی تصویر اتارنے میں بھی کسی طرح کی رسمی، روایتی تخلیقیت اور تجربہ پسندی کو راہ نہیں دی۔انھوں نے کوشش یہ کی ہے کہ اپنے اور کہانی کے بیچ کی دوری کو ختم کردیں اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے قاری سے ہم کلام ہوسکیں۔اس لحاظ سے یہ کتاب، صرف کوئی کتاب نہیں ہے اور وبھوتی نراین رائے صرف ایک شخص نہیں، ایک اسلوب فکر بھی ہے!

— شمیم حنفی

دہلی، 16/دسمبر 2003ء

شہر میں کرفیو

شہر میں کرفیو اچانک نہیں لگا تھا، پچھلے ایک ہفتے سے شہر کا وہ حصہ جہاں ہر دوسرے تیسرے برس کرفیو لگ جایا کرتا ہے، اس کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر خود کو تیار کر رہا تھا۔ پوری فضا میں ایک خاص طرح کی سنسنی تھی اور سنسنی کو سونگھ کر پہچاننے والے تجربہ کار لوگ جانتے تھے کہ جلد ہی شہر میں کرفیو لگ جائے گا۔ انہیں صرف اس بات پر حیرت تھی کہ آخر پچھلے ایک ہفتے سے کرفیو ٹلتا کیسے جا رہا تھا۔ بلوا، قریب ڈیڑھ بجے شروع ہوا۔ پونے دو بجتے بجتے پولیس کی گاڑیاں لاؤڈ اسپیکروں پر کرفیو لگنے کا اعلان کرتی گھومنے لگی تھیں، حالاں کہ کرفیو کا اعلان محض رسمی سا تھا، کیونکہ پندرہ منٹ میں خلد آباد کی سبزی منڈی سے لے کر بہادر گنج تک، جی ٹی روڈ پوری طرح سے خالی ہو گئی تھی۔ اکا دکا دکان دار اور افراتفری میں اپنے مردوں سے بچھڑی عورتیں ہی بدحواسی میں جی ٹی روڈ پر بھاگ رہی تھیں۔ اگست کے آخری ہفتے میں ہوئے اس فساد کا ریہرسل جون میں ہو چکا تھا، لہٰذا لوگوں کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ ایسے موقعوں پر کیا کیا کرنا چاہیے۔ انہیں پتا تھا۔ ایسے موقع پر سب سے پہلا کام دکانوں کے شٹر گراتے ہوئے اپنی سائیکلیں، چپل، جھولے سڑکوں پر چھوڑتے ہوئے گلی گلی اپنے گھروں کو بھاگنے کی کوشش کرنا تھا۔ انہوں نے یہی کیا اور تھوڑی ہی دیر میں جی ٹی روڈ، کاٹجو روڈ، مرزا غالب روڈ اور نور اللہ روڈ جیسی سڑکیں ویران ہو گئیں۔ صرف گلیوں کے دہانوں پر لوگوں کے جھنڈ کھڑے تھے، جو پولیس کے آنے پر اندر بھاگ جاتے اور پولیس کے ہٹتے ہی پھر واپس اپنی جگہ پر آجاتے۔ شاہ گنج پولیس چوکی کے پیچھے منہاج پور اور منصور پارک کے پیچھے گلاب باڑی

کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں کافی تیزی سے آرہی تھیں۔ ان کے علاوہ چھٹ پٹ آوازیں گلیوں سے یا اکبر پور، نہال پور اور مرزا غالب روڈ سے آرہی تھیں۔ دو بجتے بجتے فوج بھی شہر میں آگئی اور اس نے شاہ گنج، نور اللہ روڈ اور شوکت علی مارگ پر پوزیشن لے لی۔ ڈھائی بجے تک ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی جس نے جلد ہی موسلا دھار بارش کا رنگ اختیار کرلیا اور اس بارش نے سب کچھ شانت کردیا۔ تین بجے تک کھیل ختم ہو چکا تھا، لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے تھے۔

باہر سڑک پر صرف خوف تھا، پولیس تھی اور اگست کی سڑی گرمی سے نجات دلانے والی موسلا دھار بارش تھی۔

کُل ملا کر ڈیڑھ گھنٹے میں جو کچھ ہوا، اس میں چھ لوگ مارے گئے۔ تیس چالیس لوگ زخمی ہوئے اور تقریباً تین سو لوگ گرفتار کیے گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے چیل کی طرح آسمان میں منڈلانے والے ایک طوفان نے یکایک نیچے جھپٹا مار کر شہر کو اپنے نوکیلے پنجوں میں دبوچ کر نوچ کھسوٹ ڈالا ہو اور پھر اسے پنجوں میں پھنسا کر کافی اوپر اٹھ گیا ہو اور اوپر لے جا کر اسے ایک دم سے نیچے پٹک دیا ہو۔ شہر بری طرح سے لہولہان پڑا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے کے حادثے نے اس کے جسم کا جو حال کیا تھا اسے ٹھیک ہونے میں کئی مہینے لگنے تھے۔

ہوا کچھ ایسا کہ قریب ڈیڑھ بجے دن میں تین چار لڑکے مرزا غالب روڈ، جی ٹی روڈ کراسنگ پر بینک آف بڑودا کے پاس ایک گلی سے نکلے اور گاڑی بان ٹولے کے پاس ایک مندر کی دیوار پر بم پھینک کر واپس اسی گلی میں بھاگ گئے۔ جو چیز دیوار پر پھینکی گئی وہ بم کم پٹاخا زیادہ تھی۔ اس سے صرف تیز آواز ہوئی، کوئی زخمی نہیں ہوا۔ بم چوں کہ مندر کی دیوار پر پھینکا گیا تھا اس لئے اس وقت وہاں موجود ہندوؤں نے مان لیا کہ بم پھینکنے والے مسلمان ہی رہے ہوں گے، اس لیے انہوں نے وہاں سے گزرنے والے مسلمانوں پر ایک دم حملہ کردیا۔ سب سے پہلے ایک موٹر سائیکل پر جانے والے تین لوگوں پر حملہ کیا گیا۔ ان میں سے ایک موٹر سائیکل سے گرتے ہی، کود کر بھاگ گیا۔ باقی دو زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے اور سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھکے اس وقت تک لاتیں، گھونسے اور ڈھیلے کھاتے رہے، جب تک پاس میں احمد گنج میں تعینات پولیس کی ایک

ٹکڑی وہاں پہنچ نہیں گئی۔ اس کے علاوہ بھی ادھر سے گزرنے والے کئی لوگ پٹے۔ تقریباً اسی کے ساتھ مرزا غالب روڈ پر صبح سے جگہ جگہ اکٹھی برافروختہ بھیڑ نے اس سڑک پر تعینات پولیس کی چھوٹی ٹکڑیوں پر حملہ کردیا۔ ان ٹکڑیوں میں دو تین سول پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ چار چار پانچ پانچ ہوم گارڈ کے جوان تھے۔ تھوڑی دیر میں کافی تعداد میں پولیس اور ہوم گارڈ کے جوان مرزا غالب روڈ سے گاڑی بان ٹولے کی طرف بھاگتے دکھائی دینے لگے۔ گلیوں کے منہ پر کھڑے حملہ آور نوجوانوں اور لڑکوں کی بھیڑ کے پتھروں سے بچنے کے لئے وہ اپنے ہاتھ سے چہرہ بچائے بینک آف بڑودا کی طرف بھاگ رہے تھے، جہاں احمد گنج سے پی اے سی اور پولیس کی ایک ٹکڑی پہنچ چکی تھی۔ ان بھاگنے والے سپاہیوں میں سے ایک بینک آف بڑودا سے قریب ایک فرلانگ پہلے ہی گر پڑا، اسے ایک بم لگ گیا تھا اور کانچ کی نکیلی کرچیں اس کے چہرے میں بھر گئی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھکے بھاگ رہا تھا۔ اچانک ایک گلی کے منہ پر بدحواسی میں ایک دم سڑک کے کنارے چلا گیا اور وہاں لڑکوں کی بھیڑ سے ٹکراتے ہوئے اس نے بیچ سڑک پر آنے کی کوشش کی کہ تبھی ایک چھرا اس کی بائیں پسلیوں پر لگا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بیچ سڑک پر گر پڑا۔

قریب قریب ایک ساتھ کئی جگہوں پر بم پھینکنے اور فائرنگ کی وارداتیں ہوئیں، یوں لگتا تھا جیسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت کوئی ان دیکھا ہاتھ ان سارے حادثوں کے پیچھے کام کررہا ہے۔ قریب قریب سبھی جگہوں پر بم پھینکے گئے، بم یا فائرنگ میں کوئی زخمی نہیں ہوا، ان کا مقصد صرف دہشت پیدا کرکے ایک خاص قسم کی سراسیمگی پھیلانا لگتا تھا اور اس میں انہیں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلے دو تین دنوں سے یہ بات ہوا میں تیر رہی تھی کہ مسلمان پولیس پر حملہ کرنے کی تیاری کررہے ہیں اور تقریباً یہی خوف پولیس کے سپاہیوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ صوبے کے مغربی علاقوں میں کچھ جھگڑے ہوئے تھے جن میں کافی مسلمان پولیس کی گولیوں سے مارے گئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے دلوں میں غصہ بھرا تھا اور اس طرح کا پرچار کیا جارہا تھا کہ مسلمان اگر اپنے محلے میں اکادکا سپاہیوں کو پاجائیں گے تو

زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے مسلم علاقوں میں اکا دکا سپاہیوں نے دو تین دن سے جانا چھوڑ دیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہتھیار بند سپاہی اور داروغہ چار چار پانچ پانچ کی تعداد میں ان علاقوں میں جاتے تھے۔

ایک ساتھ کئی جگہوں پر پولیس پر بم پھینکنے اور فائرنگ کی جو وارداتیں ہوئیں ان میں زیادہ تر جگہوں پر کوئی زخمی نہیں ہوا۔ اکثر بم پھینکے جانے والے مقامات پر پولیس کھلے میں ہوتی اور بم ہمیشہ دس پندرہ گز دائیں بائیں کسی دیوار پر پھینکا جاتا، جس سے زخمی کوئی نہ ہوتا، لیکن مان لیا جاتا کہ اسے مسلمانوں نے پھینکا ہوگا۔ اس لیے فوراً اس علاقے کے سبھی مسلمان گھروں کی تلاشی لی جاتی۔ زیادہ تر مقامات پر کچھ برآمد نہ ہوتا۔ کچھ مقامات سے گوشت کاٹنے کے چھرے تھانے میں جمع کرنے کے حکم کے باوجود گھروں میں پڑے لائسنسی اسلحہ برآمد ہوتے اور گھر کے مرد 25 آرمز ایکٹ یا دفعہ 199 میں گرفتار کر لیے جاتے۔

تین بجے جب بارش تھمی تو اس نے شہر کو اگست کی سڑی گرمی کے ساتھ ساتھ تناؤ سے بھی فوری طور پر نجات دلادی۔ پکنک اور رومانس حاصل کرنے کے ارادے سے پولیس کی گاڑیوں پر نکلے صحافیوں کو اس وقت بڑی مایوسی ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ شہر کی سڑکیں سونی پڑی ہیں۔ لوگ گھروں میں تھے، سڑکوں پر بدحواس پولیس کی گاڑیاں تھیں اور تناؤ چاہے کہیں رہا ہو فی الحال سڑکوں سے غائب تھا۔

بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دو تین سمتوں سے پولیس کی گاڑیاں آ کر شاہ گنج پولیس چوکی کے پاس رکیں۔ اس وقت تک فوج نے چوکی کے آس پاس پوزیشن لینی شروع کر دی تھی، چوکی کے اندر سے کچھ سپاہی باہر جھانک رہے تھے جب کہ چوکی کے آس پاس اور سامنے آنکھوں کے اسپتال اور نرسنگ ہاسٹل تک بالکل سناٹا تھا۔ بارش کا زور کچھ تھما ضرور تھا، لیکن بیچ بیچ میں تیز ہو جانے والی بارش پورے ماحول کو پراسرار خاموشی میں تبدیل کر رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں فائرنگ ہوئی تھی اور فائرنگ ختم ہونے کے فوراً بعد پیدا ہونے والا تناؤ پورے ماحول میں گھل مل گیا تھا۔

پولیس کی گاڑیوں سے دو ایس پی، ایک ڈی ایس پی، کچھ انسپکٹر اور سب انسپکٹر

اترے۔ ان میں سے ایک دو نے چوکی کے پاس کی عمارتوں کے برآمدے میں بارش سے بچنے کے لیے پناہ لینے کی کوشش کی، لیکن زیادہ تر لوگوں نے چوکی کے سامنے سڑک پر ایک گھیرا بنا لیا اور اگلی کارروائی کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ انہیں کنٹرول روم سے وہاں ہونے والی فائرنگ کی اطلاع ملی تھی، انہیں سڑک پر دیکھ کر چوکی میں چھپے ہوئے اکا دکا سپاہی بھی قریب آ گئے۔ سبھی کے جسم تیز پانی کی بوچھار سے بھیگے ہوئے تھے۔

جوشیلے لہجے میں ایک دوسرے کی بات کاٹتے ہوئے سپاہیوں نے جو بتایا اس کا مطلب یہ تھا کہ بیس منٹ پہلے وہاں فائرنگ ہوئی تھی۔ پولیس پر زبردست پتھراؤ ہوا تھا اور پولیس نے ایک عمارت کی چھت پر چڑھ کر فائرنگ کی تھی۔ چوکی کے پیچھے ملی جلی آبادی تھی اور کچھ دیر پہلے گلیوں سے چیخنے چلانے کی آوازیں آئی تھیں۔ اس وقت کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، لیکن انہیں پورا یقین تھا کہ پیچھے کچھ گھروں پر حملہ ہوا ہے۔

طے یہ ہوا کہ اندر گھس کر دیکھا جائے، باہر سڑک پر کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اندر گلی میں ایک بھی آدمی مارا گیا یا کسی گھر میں آگ لگائی گئی تو اس کے نتائج کافی خطرناک ہو سکتے تھے۔ ابھی تک وارداتوں کا رخ ایسا نہیں تھا جس سے کسی غیر معمولی فرقہ وارانہ فساد کا شک کیا جا سکے، لیکن ایک بار گلیوں میں آتش زنی یا چاقو بازی کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا۔

دونوں ایس پی تھوڑی دیر تک آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے، پھر ایک جھٹکے سے وہ گلی میں گھسے۔ ان کے پیچھے پی اے سی اور پولیس کا جتھا تھا۔ منہاج پور ایک پارک کے چاروں طرف بسا ہوا محلّہ تھا، جس میں کھاتے پیتے مسلمانوں کے دو منزلہ سہ منزلہ مکان تھے۔ دوسرے مسلمان علاقوں کی غریبی اور گندگی سے یہ علاقہ پاک صاف تھا۔

موسلا دھار بارش اور دہشت زدہ سناٹے نے ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ پولیس اور پی اے سی کے جوان اپنے بوٹوں کی آواز سے خود بیچ بیچ میں چونک جاتے تھے۔ سارے انسپکٹروں اور سب انسپکٹروں کے ہاتھوں میں ریوالور یا پستولیں تھیں اور سپاہیوں کے ہاتھوں میں رائفلیں۔ سب نے اپنے ہتھیار مکانوں کی طرف تان رکھے تھے۔ ہر مکان کے چھجے پر دشمن نظر آ رہا تھا، سب کی انگلیاں گھوڑوں پر کسی ہوئی تھیں

اور جوش میں کسی لمحے کوئی بھی انگلی ٹریگر پر ضروری دباؤ ڈال کر ایسی صورت حال پیدا کرسکتی تھی، جس سے فائر ہوجائے۔ بیچ بیچ میں ٹھہر کر افسر لوگ دبی زبان میں جوانوں کو رائفلوں کی نالوں کا رخ ہوا میں رکھنے کا حکم دے رہے تھے۔ وہ مکانوں کے برآمدوں اور کھمبوں کی آڑ لے کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ ڈرے ہوئے لوگوں کا گروہ تھا اور ہر آدمی نے اپنے دل میں ایک خیالی دشمن گڑھ رکھا تھا جو اسے مکانوں کے چھجوں یا گلیوں کے دہانوں پر دکھائی پڑ جاتا، لیکن بندوق کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی وہ دشمن غائب ہوجاتا تھا۔

جہاں پارک ختم ہوتا تھا وہاں پہلی بار ٹکڑی کو کامیابی ہوتی نظر آئی۔ پارک کے ایک دم کونے پر زمین پر گاڑھا لال خون ایک بڑے دائرے میں سڑک پر پڑا تھا، اس خون کو چاروں طرف سے کسی نے اینٹوں سے گھیر دیا تھا، اینٹوں کا یہ گھیرا چھوٹا تھا اور تیز بارش کی وجہ سے خون کا دائرہ پھیل کر اینٹوں کے گھیرے سے باہر نکل گیا تھا۔ خون بہت گاڑھا تھا اور پوری طرح سے جم نہیں پایا تھا۔ بارش کے پانی نے اسے چاروں طرف چھترا دیا تھا، پھر بھی اینٹوں کے گھیروں میں وہ جگہ تلاش کرنا مشکل نہیں تھا، جہاں کوئی گولی کھا کر گرا ہوگا، کیوں کہ درمیان میں ایک جگہ پر خون زیادہ موٹے لوتھڑے کی صورت میں پڑا تھا اور وہاں سے بارش اسے بہا کر پتلی پتلی لکیروں کی طرح مختلف سمتوں میں لے گئی تھی۔

ٹکڑی کے سینئر افسروں نے تھوڑی دیر تک خون کی موجودہ حالت اور بہنے والی لکیروں کی سمتوں کا معائنہ کیا۔ باقی سبھی لوگ اپنے ہتھیاروں کو کس کر پکڑے چاروں طرف بارجوں اور چھجوں پر نگاہ گڑاتے رہے۔ تیز ہونے والی بارش نے چاروں طرف دھند لکے کی ایک پرت سی جما دی تھی۔ اس کے پار چھجوں پر کوئی صاف صورت دیکھ پانا نہایت مشکل تھا۔ پھر بھی کوشش کرنے پر ہر برآمدے میں کسی کھمبے یا کھڑکی کی آڑ میں کوئی نہ کوئی پرچھائیں دکھائی پڑ ہی جاتی اور بندوق پر بھنچی ہوئی انگلیاں اور سخت ہوجاتیں، لیکن تھوڑی دیر لگاتار دیکھنے کے بعد پتہ چلتا کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی انہیں دھوکا ہوا ہے لہٰذا انگلیاں دھیرے دھیرے ڈھیلی ہوجاتیں۔

خون کی دھار دیکھ کر افسروں نے ایک گلی کا راستہ پکڑا۔ گلی پارک کی حد سے شروع ہوتی تھی، راستے پر پڑی لال خون اور کیچڑ سنی لکیر دیکھنے سے ایسا لگتا تھا کہ کسی زخمی آدمی کو لوگ گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ پورے محلے کے دروازے بند تھے، بارش اور سناٹے نے یہ کام مشکل بنا دیا تھا کہ اس بات کا پتہ کیسے لگایا جائے کہ زخمی کس مکان میں چھپایا گیا ہے۔ صرف زمین پر پھیلی اور پانی سے کافی حد تک دھلی پھیلی لکیر ہی ایک ایسا سہارا تھی جس کے ذریعہ تلاش کی کچھ امید کی جاسکتی تھی۔

گلیاں عجیب مایا جال کی طرح پھیلی تھیں۔ ایک گلی ختم ہونے سے پہلے کم سے کم تین حصوں میں بٹتی تھی۔ آسمان میں چھائے بادلوں اور تیز بارش نے دن دوپہر کو ڈھلتی شام سے ہم کنار کر دیا تھا۔ گلیوں میں ہلکا ہلکا اُمس بھرا اندھیرا تھا، اس پورے ماحول کے بیچ سے خون کی لکیر دیکھتے ہوئے آگے بڑھنا اور خیالی دشمن سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا دونوں کافی مشکل کام تھے۔ آگے کے دو تین افسر زمین پر نگاہیں گڑائے خون کی لکیر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے اور پیچھے کی ٹکڑی کے لوگ اپنی پستولوں اور رائفلوں کا رخ چھجوں اور بارجوں کی طرف کئے دشمن سے حفاظت کی کوشش کر رہے تھے۔ بارش کے تھپیڑے گلی کی اونچی دیواروں کی وجہ سے ایک دم سیدھے منہ پر تو نہیں لگ رہے تھے، لیکن تیز موسلا دھار بارش نے لوگوں کو سر سے پاؤں تک شرابور کر رکھا تھا۔

اچانک آگے چلنے والا ایک افسر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ دوسرے افسر نے بھی دھیان سے کچھ سننے کی کوشش کی اور وہ بھی ٹھٹکا سا ایک جگہ کھڑا ہو کر صاف صاف سننے کی کوشش کرنے لگا۔ باقی ٹکڑی میں سے کچھ لوگوں نے ان دونوں افسروں کا کھنچا ہوا چہرہ دیکھ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور پھر دیواروں کی آڑ میں کھڑے ہو کر اندازہ لگانے لگے۔

بارش اور سناٹے سے بھیگے ہوئے ماحول کی خاموشی کو توڑتی ہوئی رونے کی آوازیں ہلکی ہلکی تیرتی ہوئی اس مجمع کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ آوازوں نے انہیں اور زیادہ ہوشیار کر دیا اور وہ لوگ آہستہ آہستہ پاؤں جما کر اسی سمت میں بڑھنے لگے۔ تھوڑی ہی دور بڑھنے پر آواز کچھ صاف سنائی دینے لگی۔

یہ رونے کی ایک عجیب طرح کی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے چار پانچ عورتیں رونے کی

کوشش کر رہی ہوں اور کوئی ان کا گلا دبائے ہوئے ہو۔ بھنچے گلے سے رونے کا ایک الگ ہی درد ہوتا ہے۔ ڈراؤنا اور اندر تک توڑ دینے والا۔ یہ رونا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جو آواز چھن کر پہنچ رہی تھی وہ پتھر سے پتھر دل آدمی کو بھی ہلا دینے کے لیے کافی تھی۔

آواز کا پیچھا کرتے کرتے پولیس کی ٹکڑی ایک چھوٹے سے چوک تک پہنچ گئی۔ چوک سے تین سمتوں میں گلیاں پھوٹتی تھیں۔ چاروں طرف اونچے اونچے مکانوں کے درمیان یہ چوک عام دنوں میں بچوں کے لیے چھوٹے سے کھیل کے میدان کا کام کرتا تھا اور دن میں اس وقت گلزار بنا رہتا تھا، لیکن آج وہاں بالکل سناٹا تھا۔ پولیس والوں کے وہاں پہنچتے پہنچتے آواز ایک دم غائب ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا کہ پولیس کے وہاں تک پہنچنے کی آہٹ ماتم والے گھر تک پہنچ گئی تھی اور رونے والی عورتوں کا منہ بند کرا دیا گیا تھا۔

اس چھوٹے سے چوک کے اندر جتنے مکان تھے، پولیس والے پوزیشن لے کر ان کے باہر کھڑے ہوگئے۔ افسر بھی ایک کھمبے کی آڑ لے کر اگلے قدم کے بارے میں دبی آواز سے بحث کرنے لگے۔ اتنا یقین تھا کہ وہ مکان جس کے اندر رونا ہو رہا تھا، یہیں کہیں قریب ہی تھا، کیونکہ ان کے اس چوک میں پہنچتے ہی آوازیں ایک دم بند ہوگئی تھیں۔ انہوں نے کھمبوں کی آڑ ہی سے چوک کی زمین پر خون کی لکیر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ خون کا شائبہ زمین پر ملنا یہاں پر مشکل تھا کیوں کہ اس علاقے میں پانی صرف آسمان سے نہیں برس رہا تھا بلکہ قریب قریب بھی مکانوں کی چھتوں سے نالیاں سیدھی چوک میں کھلتی تھیں، چھتوں کا اکٹھا پانی نالیوں سے ہوکر چوک میں موٹی دھار کی شکل میں گر رہا تھا اور اس سے پوری زمین لبریز تھی۔

اچانک ایک سپاہی نے جوشیلے انداز میں اپنا ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ وہ ایک بڑے سے حویلی نما مکان کی سیڑھیوں پر دروازے سے لگ کر کھڑا تھا۔ دروازے کے اوپر نکلا بارجہ اسے بارش سے بچا رہا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر اسے لال رنگ کا دھبا نظر آ گیا۔ حالاں کہ اس دھبے پر بارجے کی وجہ سے سیدھی بارش نہیں پڑ رہی تھی، پھر بھی آڑی ترچھی بوچھاروں نے اسے کافی دھندلا دیا تھا، اس لیے اس کے ٹھیک بغل میں کھڑے سپاہی کی بھی نگاہ اس پر دیر سے پڑی۔ اس کو ہاتھ ہلاتا دیکھ کر کچھ پولیس افسر

اور داروغہ تیزی سے اپنی اپنی آڑ سے نکلے اور جھکی ہوئی پوزیشن میں تقریباً دوڑتے ہوئے اس بارجے تک پہنچ گئے۔

وہاں پہنچ کر کچھ نے جھک کر چوکھٹ کا معائنہ کیا جہاں پہلی بار خون کا دھبا دکھائی دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی جگہ پر ہلکے دھندلے لال دھبے دکھائی پڑنے لگے۔ اتنا یقین ہو گیا کہ اسی گھر میں کوئی زخمی حالت میں لایا گیا ہے۔

ایک افسر نے دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا۔ اندر پوری طرح سناٹا تھا۔ اس نے تھوڑی تیزی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس نے ایک داروغہ کو اشارہ کیا۔ داروغہ نے آگے بڑھ کر دروازہ تقریباً پیٹنا شروع کر دیا۔ کوئی جواب نہ پاکر اس نے دروازے کو تین چار لاتیں لگائیں، لات لگنے سے دروازہ بری طرح ہل گیا۔ پرانا دروازہ تھا، ٹوٹنے کی حالت میں آ گیا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ اندر سے کچھ ایسی آواز آئی، جیسے کوئی دروازے کی طرف آ رہا ہے۔

سیڑھیوں پر کھڑے لوگ دونوں طرف کنارے سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔ دو ایک نے اپنے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیے۔

دروازے کے پاس پہنچ کر قدموں کی آہٹ ختم گئی۔ صاف تھا کہ کوئی دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر دروازہ کھولنے نہ کھولنے کے پس و پیش میں تھا۔ پھر اندر سے چٹخنی گرنے کی آواز آئی اور ایک ماتمی خاموشی کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔

سامنے ایک مرجھایا ہوا سپاٹ بوڑھا چہرہ تھا، جسے دیکھ کر یہ اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ مکان میں کیا کچھ رونما ہو چکا ہوگا۔

''سب کے سب بہرے ہو گئے تھے کیا؟ ہم لوگ اتنی دیر سے برسات میں کھڑے بھیگ رہے ہیں اور دروازہ پیٹ رہے ہیں۔''

بولنے والے کی جھنجھلاہٹ نے بوڑھے کو پوری طرح بے چین کر دیا۔ اس کی خاموشی غیر معمولی تھی، دروازہ کھلنے سے کچھ بوچھاریں اس کی پیشانی اور چہرے پر پڑیں اور اس کی سفید داڑھی میں آ کر الجھ گئیں۔

''اندر کوئی زخمی چھپا ہے کیا—؟''

''جی نہیں...... کوئی نہیں ہے —'' اس کی آواز اتنی ٹھہری ہوئی تھی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے کسی نے اسے ڈپٹنے کی کوشش نہیں کی۔

''بڑے میاں! ہم زخمی کے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں، تم اسے ہمارے حوالے کردو، ہم اسے اسپتال تک اپنی گاڑی سے پہنچادیں گے۔ دوا دارو وقت سے ہوگیا تو بچ سکتا ہے، نہیں تو اب پتہ نہیں کتنے دنوں تک کرفیو لگا رہے اور ہوسکتا ہے کہ علاج نہ ہونے سے حالت اور خراب ہوجائے۔''

''آپ مالک ہیں حضور، پورا گھر کھلا ہے، دیکھ سکتے ہیں، اندر کوئی نہیں ہے۔''

اس نے گھر کی طرف اشارہ کیا، لیکن خود دروازے پر سے نہیں ہٹا۔ وہ پورا دروازہ گھیرے کھڑا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، بوڑھے چہرے کی غیر جذباتیت نے بوندا باندی کے ساتھ مل کر پورے ماحول کو اس قدر پُراسرار بنادیا تھا کہ سب کچھ ایک طلسم سا لگ رہا تھا۔

سب کو شش وپنج میں دیکھ کر بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازہ بند کرنا شروع کردیا۔ اس کے حرکت میں آتے ہی یہ طلسم اچانک ٹوٹ گیا اور ایک افسر نے جھپٹ کر اپنا ڈنڈا دونوں دروازوں کے بیچ پھنسادیا۔ بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

دروازے کے فوراً بعد ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، اس کمرے کے بعد آنگن تھا جس کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ برآمدے سے لگے ہوئے چاروں طرف پانچ چھ کمرے تھے جن کے دروازے آنگن کی طرف کھلتے تھے۔ برآمدے میں سات آٹھ عورتوں، دو تین جوان مردوں اور تین چار بچوں کا ایک ماتمی دستہ تھا جو ایک چارپائی کو گھیرے کھڑا تھا۔ زخمی ننگی چارپائی پر پڑا تھا، خون چارپائی کی رسیوں کو بھگوتا ہوا زمین پر پھیل گیا تھا۔ حالاں کہ خون سے چارپائی پر لیٹے آدمی کا پورا جسم نہایا ہوا سا تھا، پھر بھی غور سے دیکھنے پر صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کے بائیں کندھے سے قریب ایک بتا نیچے سینے پر چپکا ہوا قمیص کا حصہ زیادہ سرخ اور گاڑھے خون سے آلودہ تھا۔ گولی وہیں لگی تھی۔

اپنی تجربہ کار آنکھیں چارپائی پر لیٹی صورت پر دوڑانے کے بعد ایک داروغہ نے اپنی بغل میں کھڑے افسر کے کان میں بہت آہستہ سے کہا:

''مر گیا ہے حضور ——''

افسر نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ کسی نے سنا نہیں تھا۔ چارپائی کے ارد گرد کھڑی عورتیں اور مرد ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ چارپائی پر لیٹا آدمی صرف زخمی پڑا ہے، مرا نہیں ہے۔ خاص طور سے عورتیں یہی سوچ رہی تھیں یا ہوسکتا ہے ان میں سے کچھ لوگوں کو احساس ہو چکا ہو کہ زخمی مر گیا ہے لیکن وہ اس بات کو ماننا نہ چاہتے ہوں۔

عورتوں نے پھر سے رونا شروع کر دیا۔ زیادہ تر عورتیں پردہ کرنے کے لیے اپنے ماتھے پر کپڑا ڈالے ہوئے تھیں۔ وہ بھنچی آواز میں دھیرے دھیرے بے نقط رو رہی تھیں۔ ان کے جسم ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ ان کے رونے کی آواز اور بدن کی تھرتھراہٹ میں ایک عجیب سی لے تھی اور یہ لے تبھی ٹوٹتی تھی، جب ان میں سے کوئی ایک اچانک دوسری سے تیز آواز میں رونے لگتی یا کسی کا جسم دوسری عورتوں سے تیز کانپنے لگتا۔

افسروں نے آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کی اور ان میں سے ایک نے اپنے ماتحت کو حکم دیا:

''زخمی کو چارپائی سمیت اٹھالو۔ کالونی میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور مل جائے گا۔''

پولیس کے چار پانچ لوگوں نے پھرتی سے چارپائی چاروں طرف سے پکڑ کر ہاتھوں پر اٹھالی۔ چارپائی کے چاروں طرف اب بھی عورتیں اور مرد کھڑے چپ چاپ دیکھ رہے تھے، صرف عورتوں کے رونے میں رکاوٹ پڑی۔

''آپ لوگ بھی مدد کیجیے۔ جتنی جلدی اسپتال پہنچیں گے اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

ارد گرد کھڑی عورتوں اور مردوں میں کچھ ہلچل ہوئی۔ دو تین مردوں نے چارپائی کو ہاتھ لگایا۔ چارپائی تھامے لوگ دھیرے دھیرے دالان سے باہر دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

ایک عورت کو اچانک کچھ یاد آیا۔ وہ دوڑ کر ایک موٹی چادر لے آئی اور اس نے لیٹے ہوئے آدمی کو چادر اڑھا دی۔ باہر بارش تیز تھی۔ شروع میں جس بوڑھے نے دروازہ کھولا تھا اس نے برآمدے میں ایک کھونٹی پر ٹنگا چھاتا اتار لیا اور چارپائی پر لیٹے

آدمی کے منہ پر آدھا چھاتا کھولا اور پھر بند کر دیا۔ وہ مطمئن ہو گیا کہ باہر بارش میں یہ چھاتا کام کرے گا۔

چارپائی کو لوگ اس طرح اٹھائے ہوئے تھے کہ وہ ان کی کمر تک ہی اٹھی تھی، دروازے پر آ کر لوگ رک گئے۔ چارپائی جوں کی توں دروازے سے نہیں نکل سکتی تھی۔ باہر نکالنے کے لیے اسے ٹیڑھا کرنا ضروری تھا۔ پائنتی کی طرف کے لوگوں نے دہلیز سے باہر نکل کر چارپائی پکڑی۔ چوڑائی میں بھی ایک طرف سے لوگ ہٹ گئے۔ صرف تین طرف کے لوگوں نے ایک طرف چارپائی ٹیڑھی کر کے اسے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ چارپائی بار بار پھنسی جا رہی تھی، بہت صبر اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ چارپائی دھیرے دھیرے آدمی سے زیادہ جھک گئی اور اس پر لیٹا شخص ڈھلان کی طرف لڑھکنے سا لگا۔ دو تین لوگوں نے جھپٹ کر اسے سنبھالا۔ پوری حرکت کو پیچھے سے منظم کرنے والے افسر نے جھنجھلا کر تیزی دکھانے والے کو ڈانٹا:

''سنبھال کے نکالو۔ ابھی لاش گر جاتی۔''

''لاش'' کے لفظ نے ماحول کو پوری طرح متھ ڈالا، عورتیں سہم کر ٹھٹک گئیں۔ بوڑھے نے ایک لمبی سسکاری لی اور اپنے ہاتھ کے چھاتے پر پورا بوجھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک وہ اتنا بوڑھا ہو گیا کہ اسے چھاتے کا سہارا لینے کی ضرورت پڑنے لگی۔

عورتوں نے پہلی بار مٹی کا ماتم شروع کیا۔ ان کی دبی آواز پوری بلندی سے اٹھنے گرنے لگی۔ کچھ نے اپنی چھاتی زور زور سے پیٹنا شروع کر دی۔ بھلاوے کا ایک خفیف سا پردہ جسے انہوں نے اپنے چاروں طرف بن رکھا تھا، ایک دم سے تار تار ہو گیا۔ جس وقت زخمی وہاں لایا گیا ہوگا اس وقت ضرور اس کے جسم میں حرکت رہی ہوگی، دھیرے دھیرے جسم مردہ ہو گیا ہوگا لیکن وہ اسے ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ پہلی بار ''لاش'' کے لفظ نے ان کو اس حقیقت سے واقف کرایا تھا۔

ان عورتوں میں سے دو تین جھپٹیں اور بانہیں پھیلائے مردے کے اوپر گر پڑیں۔ تب تک چارپائی باہر نکل گئی تھی۔ اس کا آدھا حصہ بارجے کے نیچے تھا اور آدھا بارش کے نیچے، جو لوگ پاؤں کے پاس چارپائی پکڑے تھے وہ پوری طرح بارش کی زد میں

تھے۔عورتوں کے پچھاڑ کھا کر چارپائی پر گرنے کے سبب چارپائی زمین پر گر پڑی۔ باقی عورتیں بھی چارپائی کے چاروں طرف بیٹھ گئیں، اوپر بارش تھی، نیچے عورتوں کا ماتمی دستہ تھا اور ان سب سے شرابور ہوتی ہوئی بیچارے مردوں کی خاموشی اور اداس بھیڑ تھی۔

مردوں میں سے کچھ لوگ آگے بڑھے۔ انہوں نے عورتوں کو آہستہ آہستہ چارپائی سے الگ کرنا شروع کیا، کچھ عورتیں ہٹائے جانے پر چھٹک چھٹک کر پھر سے لاش پر جا پڑتیں۔ مردوں نے ہلکی سختی سے انہیں ڈھکیل کر الگ کیا۔

پولیس والوں اور گھر کے مردوں میں سے کچھ نے پھر سے چارپائی اٹھالی۔ اس بار انہوں نے چارپائی اپنے کندھوں پر لادلی۔ تیز رفتار سے وہ گلی کے باہر کی طرف بھاگے۔ مشکل سے دس قدم پر گلی بائیں طرف مڑتی تھی۔ پہلے چارپائی عورتوں کی نظر سے اوجھل ہوئی۔ پھر اس کے پیچھے چلنے والا قافلہ بھی دھیرے دھیرے غائب ہوگیا۔ صرف ماتم کرنے والی عورتوں کی آوازیں ان کا پیچھا کرتی رہیں۔ دھیرے دھیرے وہ آوازوں کی حد کے باہر چلے گئے۔ اگر بیچ میں اونچے اونچے مکانوں کی دیواریں نہ ہوتیں اور وہ دیکھ سکتے تو دیکھتے کہ عورتیں گھر کے اندر چلی گئیں ہیں اور ایک بوڑھا آدمی بارش کی ہلکی بوچھاروں میں چھاتے کی ٹیک لگائے دروازے کے بیچ کھڑا ہے۔ اسے دروازہ بند کرنا تھا، لیکن وہ پتہ نہیں بھول گیا تھا یا شاید اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اب دروازہ بند کرنے کا کوئی حاصل نہیں رہ گیا ہے۔ اس لیے وہ چپ چاپ بے چین خاموشی کے ساتھ کھڑا تھا۔

2

کرفیو لگنے کے ساتھ ہی یکبارگی بہت سی چیزیں اپنے آپ ہی وجود میں آ گئیں۔ مثلاً شہر کا ایک حصہ پاکستان بن گیا اور اس کے رہنے والے پاکستانی۔ یہ حصہ جانسن گنج سے اتالہ اور خلد آباد سے مٹھی گنج کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ ہر سال دو ایک بار ایسی نوبت ضرور آتی تھی جب شہر کے باقی حصوں کے لوگ اس حصے کے لوگوں کو پاکستانی قرار دیتے تھے۔ پچھلے کئی سالوں سے جب کبھی شہر میں کرفیو لگتا تو اس کا مطلب صرف اس علاقے میں کرفیو سے ہوتا۔ اس کے پرے جو شہر تھا وہ ان حادثوں سے بالکل بے خبر اپنے آپ میں مست ڈوبا رہتا۔ جنکشن سے سول لائنز کی طرف اترنے والوں کو یہ احساس بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ چوک کی طرف کتنا خوفناک سناٹا پھیلا ہوا ہے۔ کٹرا، کیٹر گنج یا سول لائنز کے بازاروں میں زندگی اپنی چہل پہل سے بھرپور رہتی اور چوک، مٹھی گنج میں لوگ دن کے ان چند گھنٹوں کا انتظار کرتے جب کرفیو میں چھوٹ ہوتی اور وہ بھیڑوں کی طرح بھڑ بھڑا کر سڑکوں پر نکل کر دوزخ سے نجات محسوس کرتے۔

اس بار بھی یہی ہوا۔ شہر کے پاکستانی حصے میں کرفیو لگ گیا۔ کچھ سڑکیں ایسی تھیں جو ہندو اور مسلم آبادی کے بیچ سے ہو کر گزرتی تھیں۔ ان کے مسلم آبادی والے حصے میں کرفیو لگ گیا اور وہاں زندگی پوری طرح سے تھم گئی۔ جب کہ ہندو آبادی والے حصوں میں زندگی کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی۔

سعیدہ کے لیے یہ پہلا کرفیو تھا۔ پچھلے جون میں جب کرفیو لگا تھا تو وہ گاؤں گئی ہوئی تھی۔ جس وقت کرفیو لگا وہ چوک میں گھنٹا گھر کے پاس ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر کی دکان میں اپنی دوسری لڑکی کو دوا دلانے لے گئی تھی۔ اس کی بڑی لڑکی گھر پر اپنی دادی کے پاس رہ

گئی تھی۔ سعیدہ پہلے ہی دن سے اپنی ساس سے منت کر رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کی دکان تک چلی چلے، لیکن ایک تو بیڑی کا دھندا ایسا تھا کہ اس میں دو تین گھنٹے کی بربادی سے دوسرے دن کی روٹی خطرے میں پڑ جاتی تھی اور شاید اس لیے بھی کہ اس کے تابڑ توڑ دو دو لڑکیاں ہوگئی تھیں اور اس کی ساس کو اس کی لڑکیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ آج تک ٹال مٹول کرتی رہی۔ اس کی صلاح پر سعیدہ لڑکی کو گھریلو دوائیں دیتی رہی لیکن آج جب سویرے سے پوری طرح پست دکھائی دینے لگی تب اس نے اپنی پڑوسن سیف النساء کو بمشکل تمام اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ گھنٹا گھر تک چلے۔ بدلے میں اس نے سیف النساء کے ساتھ چوڑی کی دکان تک چلنے کا وعدہ کیا۔ جہاں سے سیف النساء چوڑیاں خریدنے کے لیے کافی دنوں سے سوچ رہی تھی۔

دوا لے کر وہ ابھی دکان کے باہر نکلی ہی تھیں کہ کرفیو لگ گیا۔ دراصل کرفیو لگنے کی کوئی رسمی کارروائی نہیں ہوئی لیکن سیف النساء کے تجربے نے اسے بتا دیا کہ کرفیو لگ گیا ہے۔ پورے چوک میں عجیب افراتفری تھی۔ دوکانوں کے شٹر اتنی تیزی سے گر رہے تھے کہ ان کی ملی جلی آواز پورے ماحول میں خوف کا زبردست احساس طاری کر رہی تھی۔ جس طرح بچے ایک قطار میں اینٹیں کھڑی کر کے انہیں ایک سرے سے ڈھکیلتے ہیں تو لہروں کی طرح اینٹیں ایک کے اوپر ایک گرتی چلی جاتی ہیں اسی طرح بھیڑ کے ریلے نخاس کی طرف سے گھنٹا گھر کی طرف چلے آ رہے تھے۔

''یا خدا...... رحم کر!'' سیف النساء کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس نے جھپٹ کر سعیدہ کی کلائی تھام لی، جب تک اچانک منہ کھولے سعیدہ کچھ سمجھتی تب تک وہ اسے گھسیٹتی ہوئی بازار میں قریب پچیس تیس گز آگے بڑھ گئی۔

''کا ہوا بہن ـــ؟''

''کرفو...... کرفو...... یا خدا، کسی طرح گھر پہنچ جائیں۔''

ایک ایک قدم آگے بڑھنا مشکل تھا۔ مخالف سمت سے لہروں کی طرح جم غفیر پھٹا پڑ رہا تھا۔ دکان دار بدحواس اپنا سامان سمیٹ رہے تھے، سائیکلیں، رکشے، گاڑیاں اور اکّے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنے کے چکر میں اس قدر ریل پیل مچائے ہوئے

تھے کہ عام دنوں کے لیے مناسب چوڑی سڑک بھی کسی پتلی گلی کی طرح ہوگئی تھی۔

سیف النساء، سعیدہ کو گھسیٹتے ہوئے کسی طرح پھل منڈی تک پہنچ پائی۔ پھل منڈی کے دہانے پر روز ریلا لگانے والے ٹھیلے غائب تھے۔ ٹھیلے والے بڑی جلدی میں گلیوں یا گھنٹا گھر کی طرف بھاگ گئے تھے۔ یہ پہلی ہی نظر میں عیاں ہوجاتا تھا کہ کیوں چاروں طرف آم، سیب اور سنترے بکھرے پڑے تھے، جنہیں بدحواس لوگ کچلتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ سیف النساء، کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ سعیدہ کو لے کر پھل منڈی ہی میں گھس گئی اور اسے پار کرتی ہوئی میسر گنج کی بھول بھلیوں میں بھٹک گئی۔

میسر گنج کا جسم کا بیوپار پوری طرح ٹھنڈا پڑا تھا۔ رنڈیوں نے اپنے دروازے بند کرلیے تھے اور روز جھنڈ کے جھنڈ مٹر گشتی کرنے والے گاہکوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ دو دو چار گھروں کے بعد اوپری منزل کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی کوئی رنڈی، ایک عام منظر تھا، ان رنڈیوں کی آنکھوں میں بے چارگی اور غصہ صاف دکھائی پڑتا تھا، کیونکہ انہیں پچھلے کئی دنگوں کا تجربہ تھا۔ ہر بار کرفیو لگنے پر دھیرے دھیرے وہ فاقے کے قریب پہنچ جاتی تھیں اور زیادہ تر کوٹھوں پر تو چار چھ دن بعد ہی سے خالی پانی پینے کی نوبت آجاتی تھی۔

سیف النساء یہاں کے ماحول سے پہلے سے واقف تھی، دو بار وہ اپنے شوہر کے ساتھ خریداری کرنے کے لیے ان گلیوں کے پاس کی دکانوں پر گئی تھی اور باہر سے جھانک کر جتنی دور دیکھا جاسکتا تھا اتنی دور تک گلی کا جائزہ اس نے لیا تھا۔ سعیدہ کے لیے آج پہلا موقع تھا جب وہ ان گلیوں کو دیکھ رہی تھی، اس لیے اسے گنہگاری، سنسنی اور شرم کی ملی جلی کیفیت محسوس ہورہی تھی۔ سیف النساء کے بتائے بغیر بھی وہ جان گئی تھی کہ وہ کہاں آگئی ہے۔ سیف النساء اس کی کلائی پکڑے کھینچتی چلی جارہی تھی۔ سناٹے اور خوف کی وجہ سے گلیاں اسے عجیب طرح کے اسرار سے بھری لگ رہی تھیں۔ انہیں کی طرح گھبرائے ہوئے اکادکا لوگ پاس سے گزرتے ہوئے اس رنگ کو زیادہ گہرا بناتے جارہے تھے۔ بڑی مشکل سے ان گلیوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے وہ گڑ منڈی کے پاس واپس جی ٹی روڈ پر نکلیں۔

اس وقت تک جی ٹی روڈ کافی حد تک خالی ہوگئی تھی۔ پولیس کی ایک جیپ بڑی تیزی

سے ان کے پاس سے گزری۔ اس میں بیٹھا ہوا ایک افسر ہیجان زدہ آواز میں کرفیو لگائے جانے کا اعلان کر رہا تھا اور لوگوں سے فوراً اپنے گھروں میں لوٹ جانے کی اپیل کر رہا تھا۔

کرفیو کا اعلان سعیدہ کے لیے ایک خوفناک تجربہ تھا۔ اپنی بچی کو چھاتی سے چپکائے ہوئے وہ پوری طرح سیف النساء کی مرضی پر کھنچی چلی جا رہی تھی۔ سیف النساء زیادہ تجربہ کار اور بہادر تھی۔ اس لیے اپنے کو اس کے اوپر چھوڑ کر وہ خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ دراصل سعیدہ کو اس شہر میں رہتے ہوئے صرف چار سال ہوئے تھے اور ابھی تک اس شہر میں وہ خود کو بالکل اجنبی محسوس کرتی تھی۔ اس کا گھر پورہ مفتی کے پاس تھا اور شادی کے چار سال بعد بھی اس کا من وہیں کے لیے ہڑکتا تھا۔ اس کا شوہر اپنے پورے خاندان کے ساتھ بیڑی بناتا تھا اور شادی کے بعد شروع کے کچھ مہینوں کو چھوڑ کر جب وہ اس کے ساتھ سنیما، بازار وغیرہ جایا کرتا تھا، اسے اکثر سودا سلف لانے کے لیے ساتھی کی ضرورت پڑتی تھی اور ایسے وقت سیف النساء ہی اس کے کام آتی تھی۔ سیف النساء کا شوہر جیپ فیکٹری میں چپراسی تھا۔ اس لیے اسے ہر مہینے بندھی بندھائی رقم ملتی تھی۔ وہ بیڑی بنانے کا کام کرتی ضرور تھی، لیکن شوقیہ صرف فاضل آمدنی کے لیے۔ سعیدہ کی حالت دوسری تھی، بیڑی اس کے خاندان کا واحد ذریعہ معاش تھا، اس کا پورا خاندان اوسطاً چودہ گھنٹے روز محنت کرتا تھا، تب کہیں جا کر دو جون کی روٹی کا انتظام ہو پاتا تھا۔ شادی کے دو چار ہی مہینوں میں اس نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ اس کے اور اس کے شوہر کے لیے سنیما دیکھنے یا بازار گھومنے سے زیادہ ضروری ہے کہ گھر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اندھیری سیلن بھری تنگ کوٹھری میں کمر جھکائے جھکائے بیڑی کے بنڈل باندھتے رہیں اور بچوں کا کم سے کم پیٹ بھرنے کا سکون لیے، رات میں سو سکیں۔

حالاں کہ شہر کی ٹیڑھی میڑھی نامعلوم گلیوں میں سیف النساء کا ہاتھ تھامے تھامے گزرتے ہوئے سعیدہ کو لگ رہا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا، لیکن آخر میں اسے اپنی گلی مل ہی گئی۔ اس کی گلی بھی ویران تھی، پھر بھی اس گلی میں پہنچتے ہی اسے ایک قسم کا سکون محسوس ہونے لگا۔

گلی کے مکان بری طرح بند تھے، دروازے، کھڑکیاں سبھی پوری طرح بھڑے

ہوئے تھے۔ اتنا خوفناک سناٹا اور اتنی خاموشی سعیدہ نے آج تک اپنی گلی میں محسوس نہیں کی تھی۔ اسے لگا کہ ویران گلی میں وہ اپنا گھر بھول جائے گی۔ ان کے گلی میں پہنچنے کے بعد دو ایک کھڑکیاں ہلکی سی کھڑکیں۔ ایسا لگا جیسے کسی نے جھانک کر ایک دم سے کھڑکی کے پلے بند کردیئے، کھڑکیوں کے اس طرح کھلنے بند ہونے سے سعیدہ کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سیف النساء کا گھر پہلے پڑتا تھا اس سے کچھ اور آگے سعیدہ کا گھر تھا۔

سیف النساء کے ہاتھ چھڑا کر اپنے گھر میں گھسنے کے بعد اس کے اور اپنے گھر کے بیچ کے تیس چالیس گھر کے فاصلے کو پار کرنے میں سعیدہ کو کئی یگ لگ گئے۔ اپنی بیٹی کو سینے سے چپکائے جب وہ اپنے گھر کے سامنے والی نالی کو پھاندتے ہوئے دروازے پر پہنچی تو خوف اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے ہلکے سے دروازے پر دستک دینی چاہی، لیکن دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی اس نے پایا کہ وہ بری طرح سے دروازہ پیٹ رہی ہے۔

سب سے پہلے اندر سے اس کی ساس کے کھانسنے کی آواز آئی، پھر کوئی مردانے قدموں کی آہٹ آکر دروازے پر ٹھٹھک گئی۔ آہٹ سے اس نے پہچانا، یہ اس کا شوہر تھا، اچانک اس کے جی میں آیا کہ وہ رونے لگے۔ گھر کے پاس پہنچتے ہی کوئی غیر مرئی احساس تھا جو اسے رونے پر مجبور کررہا تھا، جیسے ہی اس کے شوہر نے دروازہ کھولا وہ سچ مچ رونے لگی۔ پہلے دھیرے دھیرے پھر ہڑک ہڑک کر۔

سعیدہ کی ساس نے آگے بڑھ کر اس کی بیٹی کو گود میں لے لیا۔ بیٹی صبح سے زیادہ پست نظر آرہی تھی، اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے ساس بھی رونے لگی۔ پہلی بار سعیدہ کو اپنی ساس سے ممتا محسوس ہوئی اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

''کچھ نہیں ہوا... سب ٹھیک ہوجائے گا... اللہ سب ٹھیک کرے گا...'' ساس کے کہنے پر سعیدہ کو لگا کہ سچ مچ کچھ نہیں ہوا اور سچ مچ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ویسے بھی کیا ہوا تھا اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ تو بھاگ دوڑ اور سناٹے کے خوف سے گزرتی ہوئی یہاں تک آگئی تھی۔ راستے میں سیف النساء کے منہ سے اسے صرف اتنا پتا چلا کہ کرفیو نام کی کوئی چیز لگ گئی ہے، جس میں گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت ہے۔ اگلے کچھ دنوں میں یہ بات اسے زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آسکی کہ گھر سے باہر نہ نکلنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

3

کرفیو شروع میں تو ہر جگہ لگا لیکن جلد ہی ان حصوں سے اس کا اثر کم ہونے لگا جو پاکستانی نہیں تھے۔ ان حصوں میں ہندو رہتے تھے اور ہندو ہونے کے ناتے ظاہر تھا کہ اس دیش سے سچا پریم کرنے والے وہی تھے۔ اس لیے شروع میں تو لوگ ضرور کچھ گھنٹوں کے لیے اندر قید ہوئے، لیکن جلد ہی وہ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھول کھول کر جھانکنے لگے۔ بچوں نے ماں باپ کی آنکھیں بچائیں اور چبوتروں پر آ کر بیٹھ گئے۔ بیچ بیچ میں ماں باپ کان پکڑ کر چیختے چلاتے بچوں کو گھر کے اندر پٹک دیتے، لیکن بچے پھر چھوٹ کر اندر سے باہر بھاگ آتے۔

بیچ بیچ میں دو دو چار چار کی تعداد میں پولیس والے آتے اور بچوں کو ہڑکاتے ہوئے چبوتروں پر ڈنڈے پٹکتے چلے جاتے۔ بچوں کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ وہ گلیوں میں گلی ڈنڈے سے لے کر کرکٹ تک تمام کھیل کھیلنے لگے۔ کچھ عورتیں بھی باہر دروازوں پر نکل کر بتیانے لگیں۔ ان کی چنتا کا خاص موضوع یہ تھا کہ بچے کھیلتے ہوئے گلی سے باہر سڑکوں پر نہ چلے جائیں اور دفتروں دکانوں یا کارخانوں میں گئے ان کے مرد صحیح سلامت گھر لوٹ آئیں۔ زیادہ تر گھر خاندان کے کمانے والے ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ کچھ بچے بھی اسکولوں میں پھنس گئے تھے۔

جیسے جیسے دیر ہوتی جا رہی تھی، عورتوں کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ گلی کافی گھنے مکانوں کی بستی تھی، لیکن بستی کے بیچ میں ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا خالی پڑا تھا۔ اسے کسی نے برسوں پہلے خرید لیا تھا، لیکن ابھی تک اس پر کوئی تعمیر نہیں کی گئی تھی۔ برسوں

سے یہ محلے کا کوڑا خانہ بنا ہوا تھا اور برسوں سے محلے کی عورتیں مشترکہ مصیبت یا خوشی کے موقعوں پر وہاں جمع ہوکر شور شرابا کرتی چلی آرہی تھیں۔ دھیرے دھیرے کئی عورتیں وہاں اکٹھی ہوگئیں، جن کے مرد اور بچے واپس آگئے تھے، انہوں نے اپنے سبھی لوگوں کو گھروں کے اندر کرلیا اور کھڑکیوں، چھجوں سے ساری کارروائی دیکھنے لگیں اور جن کے گھر کا کوئی فرد باہر رہ گیا تھا، انہوں نے باہر کھلی جگہ پر اپنے کو اکٹھا کرلیا اور باتیں کرنے لگیں۔ ان کی آوازوں میں جوش اور دکھ بھرا ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے اندھیرا گلی میں پھیلنے لگا تھا اور باہر یوں لگتا تھا کہ کرفیو پوری سختی کے ساتھ لگ گیا ہے۔ اس لیے باہر سے گلی میں آنا جانا بہت کم ہوگیا۔ اکا دکا مردوں کے علاوہ چار پانچ بجے ہی اندر آپائے تھے، ان مردوں اور بچوں کے ساتھ کچھ عورتیں گھروں کے اندر چلی گئیں۔ آنے والے اپنے ساتھ افواہوں کا پلندا لے کر آئے تھے، ان کے پاس طرح طرح کی خبریں تھیں۔ مثلاً دسیوں ہندوؤں کی لاشیں نالیوں میں پڑی ہیں یا پولیس نے لاشیں کئی ٹرکوں میں لاد کر جمنا میں بہادی ہیں۔

یہ گلی بھی قریب قریب پڑوس کی گلی ہی کی طرح تھی، جس میں مسلمان رہتے تھے۔ اسی کی طرح گندی، مفلس اور بدبودار، گھروں کے پاخانوں کی گندگی بہہ بہہ کر گلی کی نالیوں میں پہنچ رہی تھی اور اگرچہ گلی کے روزمرہ کے باشندوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، پھر بھی باہر سے پہلی بار گلی میں آنے پر یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی ناک پر رومال رکھے بغیر گلی میں داخل ہوجائے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ ہندوؤں کی گلی تھی اس لیے کرفیو نے لوگوں کو گھروں کے اندر بند نہیں کیا تھا۔ ان کے صرف گلی کے باہر نکلنے پر پابندی لگی تھی۔

گلی میں دیوی لالہ کا داخلہ ایک تفریحی ریلیف کی طرح تھا۔

دیوی لالہ روز کی طرح صبح گلی سے نکل گئے تھے اور روز ہی کی طرح گرتے پڑتے گلی میں لوٹ رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ روز نو دس بجے رات کے بعد لوٹتے تھے اور آج دو تین گھنٹے پہلے لوٹ رہے تھے۔ روز گلی کے زیادہ تر لوگ جس وقت کھانا کھا رہے ہوتے ہیں، اسی وقت دیوی لالہ کی شراب میں ڈوبی ہوئی کڑک دار آواز ہوا میں تیرتی ہے۔ آج دیوی لالہ کچھ پہلے آگئے تھے، روز کی طرح نہ تو وہ چہک رہے تھے

اور نہ ہی شراب پینے سے پیدا ہونے والی خود اعتمادی ان کے اندر تھی۔ وہ کچھ پریشان سے تھے۔ ایک تو انہیں شراب نہیں ملی تھی اور دوسرے ان کو راستے میں کسی جگہ گرتے پڑتے آنا پڑا تھا، اس سے ان کے جسم پر جگہ جگہ کھرونچیں آ گئی تھیں اور ان کے پاجامے کے پائنچے نالیوں کے پانی اور گندگی سے شرابور تھے۔

دیوی لالہ پیشہ ور خون بیچنے والوں میں سے تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن سروپ رانی اسپتال میں جا کر اپنا خون بیچتے تھے اور چالیس پچاس روپے لے کر لوٹ آتے تھے۔ اسی آمدنی کے بل پر وہ شام کو ٹھرا چڑھا کر لوٹتے تھے۔ آج انہوں نے خون ضرور بیچا لیکن پی نہیں پائے، اس سے پہلے ہی کرفیو لگ گیا۔ وہ تب تک کرفیو والے علاقے میں داخل ہو گئے تھے، اگر کہیں انہیں پہلے پتا چل جاتا تو وہ شراب پی کر ہی کرفیو میں گھستے۔ ایک بار گھس جانے کے بعد انہوں نے باہر نکلنے کی کوشش بھی کی، لیکن شٹروں کے گرنے، لوگوں کے بدحواس بھاگنے دوڑنے اور پولیس کی لاٹھیوں نے ایک عجیب سا چکر ویو بنا دیا تھا۔ اس چکرویو میں وہ صرف آگے کو بھاگ رہے تھے اور کافی دیر بعد جب انہیں سنبھلنے کا ہوش آیا تو وہ اپنے گھر کی گلی کے دہانے پر تھے۔

دیوی کے دو ٹوپی بکری کے دو کان
دیوی لالہ بگنے پہنچے ان کو پکڑ لیا شیطان

عورتوں نے اس پریشانی کے ماحول میں بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ دو ایک نے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرانا چاہا۔ پتا نہیں یہ ماحول میں چھائی دہشت اور اداسی کا اثر تھا یا دیوی لالہ کی بے کیفی کا کہ آج بچے چپ ہو گئے۔ روز کی طرح انہوں نے روکنے پر اور زیادہ اچھل اچھل کر دیوی لالہ کی مٹی پلید نہیں کی۔ شراب نہ پینے کی وجہ سے دیوی لالہ کو اپنا بدن ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور انہیں بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''کیوں لالہ، دنگے میں بہت لوگ مرے کا؟''

سوال دیوی لالہ سے پوچھا گیا تھا، وہ اکیلے آدمی تھے جو کرفیو لگنے کے بعد کافی دیر تک کرفیو زدہ علاقے میں گھومنے کے بعد محلے میں پہنچے تھے، اس لیے منفرد ہونے کے احساس میں گم تھے، انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں سکیڑیں اور پورے یقین

سے بولنے کی کوشش کی، اگرچہ شراب نہ پینے سے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی، پھر بھی انہوں نے سنبھلنے کی پوری کوشش کی۔

''ارے چاچی! شہر میں لہاش ہی لہاش ہیں۔ دوئی ٹرک میں لہاش جاتی تو ہم خود دیکھا... پولیس والے جمنا میں بہانے لے جارہے تھے، مسلے مار چھرا چاکو چمکاتے گھوم رہے ہیں، ہندون بیچاروں کا تو کوئی رکھوالا نہیں ہے۔''

''ہے بھگوان، جو لوگ ابھی گھر نہیں لوٹے ان کا کیا ہوگا؟''

جن عورتوں کے شوہر اور بچے گھروں کو نہیں لوٹے تھے ان کے چہرے اتر گئے اور کچھ نے تو ہولے ہولے رونا سسکنا شروع کردیا، جن کے گھر کے لوگ صحیح سلامت لوٹ آئے تھے انہوں نے چٹخارے لینے شروع کردیے۔

''تو لالہ کیا مسلمان پولیس کے رہتے چاقو چھرا لیے گھوم رہے ہیں؟''

''گھوم رہے ہیں؟ ارے گھونپ رہے ہیں! کئی تو ہم اپنی سامنے مارتے دیکھے، ہندو بیچارے پٹ پٹ کر گر رہے ہیں۔ اب ان مسلوں کو جان لینے میں کتنی دیر لگتی ہے، پولیس ان کا کیا بگاڑ لے گی، کتنی لہاشیں تو ہمارے پیر کے نیچے آتے آتے بچیں۔''

دیوی لالہ ہانکے جارہے تھے۔ شراب نہ پیے رہنے سے تھوڑی خود اعتمادی ضرور بیچ بیچ میں گڑبڑا جاتی، لیکن لوگوں کے چہرے پر تیرنے والا تجسس اور دہشت انہیں پھر سے بولنے کا حوصلہ دے دیتی۔ وہ بول رہے تھے اور سوالیہ پریشان چہرے انہیں سن رہے تھے۔ یہ سلسلہ تبھی ٹوٹتا جب باہر سے گرتا پڑتا کوئی اور فرد گلی میں داخل ہوجاتا اور سننے والوں کی بھیڑ اسے گھیر لیتی۔ کرفیو لگنے کے بعد تین چار گھنٹے چوں کہ جم کر بارش ہوئی تھی، اس لیے آنے والا بری طرح بارش میں نہایا ہوتا اور پاجامے یا پینٹ کے نیچے کا پائنچا گلی کی کیچڑ سے لت پت ہوتا۔ ہر آنے والا آتا اور کھوجی بھیڑ کے پاس کھڑے ہوکر کچھ نہ کچھ نئی بات بتاتا۔ جب تک اس کی بیوی یا بچے اسے گھسیٹ نہ لے جاتے تب تک وہ لوگوں کے چہرے پر کھنچی کشمکش اور بے یقینی کی لکیروں کا مزہ لیتا رہتا۔

پولیس اور پی اے سی کے ساتھ آٹھ جوان ڈنڈے زمین پر پھنکارتے گلی کے دہانے سے اندر گھسے۔ ان کے گھستے ہی لوگ ہڑبڑا کر بھاگے۔ گرتے پڑتے لوگوں کو بھاگتے

دیکھ کر پولیس والوں میں سے ایک دو کو مسخری سوجھی۔ انہوں نے اور زور سے لاٹھیاں زمین پر پٹکیں اور ہوا میں گالیاں اچھالتے ہوئے دوڑنے کا ناٹک کیا۔ لوگ اور زور سے بھاگے اور گلی کے کیچڑ اور نالیوں کے پاخانے میں پیر سانتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے، جن کے دروازے بند تھے، انہوں نے انہیں بری طرح پیٹ ڈالا۔

گھروں میں بند ہو کر بچوں نے کھڑکیوں سے اپنی ناک سٹادی اور آنکھیں باہر جمع پولیس والوں پر مرکوز کرلیں۔ عورتیں کواڑوں کی درازوں سے چپک گئیں، مرد اپنے مرد ہونے کے احساس سے دبے اپنی تشویش کی نمائش نہیں کرسکتے تھے، اس لیے بند، امس بھرے کمروں میں پنکھے کے نیچے بیٹھے اپنے خارش زدہ بدن کھجلاتے رہے۔ بارش بند ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور ایک بار پھر سے امس پورے ماحول پر طاری ہوگئی تھی۔

پولیس والے باہر ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اس بھگدڑ میں دیوی لالہ بھی ڈر کر ایک کوڑے کے ڈھیر کے پیچھے چھپ گئے تھے، دن میں بھاگتے وقت دو چار لاٹھیاں ان کے پیر اور پیٹھ پر پڑی تھیں۔ اس لیے پولیس والوں کو دیکھ کر وہ ڈر گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ بدبودار کوڑے کو اپنی ناک پر جھیلتے رہے، پھر ہمت بٹور کر انہوں نے اچک کر دیکھا، پولیس والوں میں ایک مقامی تھانے کا سپاہی بھی تھا جسے وہ مصرا کے نام سے جانتے تھے اور جس کے ساتھ بیٹھ کر انہوں نے کئی بار شراب پی تھی، مصرا کو دیکھتے ہی ان کی ہمت لوٹ آئی اور وہ کوڑے کے ڈھیر کو تقریباً ڈھکیلتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

''جے ہند پنڈت جی! ہم تو بے کار ڈر رہے تھے۔''

''کون؟ دیوی لالہ؟ جے ہند جے ہند۔ کہو کہاں چھپے ہو؟ کیسا محلّہ ہے بھائی، سسر پانی کو بھی ترس گئے۔ آج دوپہر سے ایک بوند پانی نہیں گیا حلق میں، کچھ چائے وائے کا انتظام کرو بھائی۔''

دیوی لالہ جھپٹ کر ایک مکان کے دروازے پر پہنچے اور لگے دروازہ پیٹنے۔

''کون ہے؟ کیا ہے؟ گھر میں کوئی مرد مانس نہیں ہے۔'' اندر سے زنانی آواز آئی۔

''ہے کیسے نہیں؟ ارے ہم خود دیکھا رام سکھ کمپوزیٹر کو اندر آتے۔ بھائی ہم دیوی لالہ ہیں، باہر دروغہ جی کھڑے ہیں کھولو دروازہ کھولو، پانی چاہیے۔''

رام سکھ کمپوزیٹر نے تو نہیں لیکن دیوی لالہ کی آواز سے مطمئن ہو کر اس کی بیوی نے آدھا دروازہ کھولا۔

باہر لاٹھیوں اور بندوقوں کے ساتھ پولیس ان کے ساتھ تھی، اس لیے دیوی لالہ کافی جوش میں تھے۔ انہوں نے کڑک دار آواز میں ایک بار پھر سے رام سکھ کو باہر آنے کو للکارا۔ رام سکھ کی پتنی نے ایک بار پھر ممیاتے ہوئے بتایا کہ رام سکھ گھر میں نہیں ہیں، لیکن دیوی لالہ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر میں بات اس پر ختم ہوئی کہ رام سکھ کی گھر والی گرما گرم چائے بنا کر سب کو پلائے۔

چائے بن کر جب تک باہر آئی تب تک کچھ گھروں کی کھڑکیوں کے پلے آدھے پورے کھل چکے تھے، لیکن کچھ بچوں نے باہر نکلنے کی کوشش کی، لیکن سپاہیوں نے انہیں ڈانٹ کر اندر کر دیا۔ پر جب چائے باہر آنے لگی تو دیوی لالہ نے رام سکھ کے دو لڑکوں کو مدد کے لیے باہر بلا لیا۔ ان کی دیکھا دیکھی بغل کے دو لڑکے اور نکل آئے، سپاہیوں نے بے دلی سے انہیں ڈانٹا اور پھر چائے پینے میں لگ گئے۔ لڑکے بھی ڈھیٹوں کی طرح پہلے اپنے دروازوں سے چپکے رہے اور پھر دھیرے دھیرے گلی میں اتر آئے۔ تھوڑی دیر میں بچوں کی اچھی خاصی بھیڑ پولیس والوں کے ارد گرد اکٹھی ہو گئی۔ وہ للچائی آنکھوں سے ان کے ہتھیار دیکھتے رہے اور ان ہتھیاروں کے نام ایک دوسرے کو بتاتے رہے، بیچ بیچ میں پولیس والوں میں سے کوئی انہیں جھڑک دیتا یا اپنی لاٹھی زمین پر پٹک دیتا۔ بچے بھاگتے اور تھوڑی دور پر پھر اکٹھے ہو جاتے، وہ کورس میں گاتے:

ہندو پولیس بھائی بھائی   کٹوا قوم کہاں سے آئی

پولیس والے ہنستے اور گالی دے کر پھر چائے پینے میں لگ جاتے۔ دیوی لالہ ان کے کھانے کا انتظام کرنے لگے۔ کرفیو ہر دوسرے تیسرے سال لگتا تھا۔ پولیس والے ہر بار اسی گلی میں یا بغل کی کسی گلی میں کھانا کھاتے۔ یہاں کھانا کھا کر محلے والوں سے کچھ ہنسی مذاق کرتے اور پھر پاکستانی گلیوں میں کرفیو لگانے چلے جاتے۔

گلی میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو اکیلے اس پوری ٹکڑی کے لیے کھانے کا معقول انتظام کر سکتا۔ دیوی لالہ ایک ایک گھر کا حال جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کسی گھر پوری

چھنوائی، کہیں آلو کی بھجیا تلی گئی اور دو ایک گھروں سے ڈانٹ کر اچار اور چٹنی اکٹھا کی گئی۔

پولیس والے جب تک کھانے بیٹھے تب تک کافی لوگ ہمت بٹور کر ان کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ ہندو لوگ تھے، اس لیے فطرتاً ملک کی سب سے زیادہ فکر انہیں ہی تھی۔ انہوں نے پولیس ٹکڑی میں اپنے جاننے والوں کو ڈھونڈا یا نئے سرے سے تعارف حاصل کر لیا اور انہیں پر جوش لہجے میں خفیہ طرز کی خبریں دینے لگے۔ کسی کو جانکاری تھی کہ پاکستانی گلی کے فلاں گھر میں ٹرانسمیٹر لگا ہوا ہے۔ جس سے ایک ایک پل کی خبر بھیجی جا رہی ہے۔ اس لیے جو دنگا دوپہر بعد ہوا اس کی خبر شام کو بی بی سی سے آ گئی۔ جو ذاتِ شریف ٹرانس میٹر والی جانکاری دے رہے تھے ان سے ایک آدھ حاسد پڑوسیوں نے پوچھا بھی کہ انہوں نے بی بی سی کب سنا، لیکن باقی سب نے مان لیا کہ بی بی سی نے ضرور یہ خبر دی ہوگی۔ کچھ لوگوں نے پاکستانی گلی کے کچھ مکان بتائے جن میں ان کے مطابق ہتھیاروں کے ذخیرے تھے، ان ہتھیاروں کی تفصیل لوگوں نے اپنی اپنی عام معلومات کے مطابق الگ الگ دی۔ زیادہ تر لوگوں نے سنیما اور اخباروں میں پستولوں اور بموں کے بارے میں پڑھا تھا، اس لیے اس کے مطابق ان میں پستولوں اور بموں کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسٹین گن بھی چھپائے جانے کی خبر دی۔ پولیس والوں نے خبریں اکٹھی کیں، وہ ہر بار دنگوں میں پاکستانیوں کو سبق سکھاتے تھے۔ اس بار بھی یہ خبریں ان کے کام آنے والی تھیں۔

پولیس والوں نے کھانا کھایا اور نالیوں پر کھڑے ہو کر ہاتھ منہ دھویا، وہ تھوڑی دیر تک دانت وانت کھودتے رہے، پھر بغل والی گلی میں پاکستانیوں کو سبق سکھانے چلے گئے۔

رات کافی ڈھل چکی تھی، عام طور سے اس وقت تک یہ گلی تھک تھکا کر سو جاتی تھی، لیکن آج گلی میں گھروں، سیڑھیوں اور چبوتروں پر لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اکٹھے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گلی کی نالیوں پر چارپائیاں نہیں پڑی تھیں۔ باوجود اس کے کہ یہ ہندوؤں کی گلی تھی اور کرفیو صرف اس حد تک لگا تھا کہ لوگ گلیوں کے باہر بڑی سڑک تک نہیں جا سکتے تھے، پھر بھی امس بھری رات میں گھر کے اندر سونے کو مجبور تھے، گھروں کے اندر جانے کا خیال ہی ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے لوگ باہر گلی میں بیٹھ گئے اور گپ لڑاتے رہے۔ وہ مطمئن تھے، گلی میں بیٹھنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دباری

کمانے والے ضرور پریشان تھے کہ اگر کرفیو تین چار دن چل گیا تو گھر میں جلنے والے چولہے کی رفتار مدھم ہوتی جائے گی۔ پچھلے برسوں میں جب تک شہر کے حکمرانوں کو لگتا کہ شہر کو اچھی طرح سبق نہیں سکھایا گیا ہے، تب تک وہ کرفیو اٹھانے کو ٹالتے جاتے۔ دو تین دن لگا تار کرفیو جاری رہتا تو دہاڑی والے واویلا کرنے لگتے۔

گلی کے ایک کونے پر اچانک دو تین پتھر کسی دروازے سے ٹکرائے۔ سیڑھیوں، چبوتروں پر بیٹھے لوگ ہڑبڑا کر بھاگے۔ کچھ لوگ نالیوں میں پھنس کر گر گئے۔ کچھ عورتوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ بچوں کو سنبھالنے کے چکر میں عورتیں گر گر پڑیں، لیکن یہ بدحواسی چند منٹوں کی رہی۔ جلد ہی لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ گلی پر باہر سے کوئی حملہ نہیں ہوا بلکہ گلی کے کنارے اکٹھے بیٹھے لڑکوں ہی نے اٹھ کر یوسف درزی کے مکان کے بند دروازے پر دو تین ادھے مار دیے تھے۔ یوسف درزی اس گلی میں اکیلا مسلمان تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس کے سبھی بھائی پاکستان چلے گئے، صرف وہی رہ گیا تھا ہر فساد میں اس کی بیوی اسے تیس پینتیس سال پرانی بے وقوفی پر کوسنے لگتی اور ہر دنگے میں وہ فیصلہ کرتا کہ اس گلی کا مکان بیچ کر وہ کسی محفوظ جگہ پر مکان لے لے گا، لیکن ہر بار فساد ختم ہونے کے بعد وہ دو تین دن سبھی جگہ پر مکان ڈھونڈتا اور پھر چپ چاپ سر جھکا کر کپڑے سینے لگتا۔ فساد میں یوسف درزی کے خاندان کے لیے صرف یہی فرق پڑتا کہ وہ اپنے مکان میں قید ہو جاتا، مکان چاروں طرف سے بند کر دیا جاتا۔ دروازوں پر تختے اور چارپائیاں لگا دی جاتیں اور گھر کے کمروں میں لوگ چپ چاپ سہم کر بیٹھ جاتے۔

یوسف درزی کے نو بچے تھے۔ ان میں چھ لڑکیاں تھیں، لڑکیاں مختلف عمروں کی تھیں اور اپنی اپنی عمر کے مطابق لفڑوں میں گھری تھیں۔ وہ لفڑے محلے کے تمام لڑکے لڑکیوں کے لفڑوں کی طرح تھے، جو اسکول جانے کی عمر سے شروع ہوتے تھے اور شادی ہوتے ہی ختم ہو جاتے تھے۔ آج تک تو اس گلی میں ایسا ہوا نہیں کہ جس کے ساتھ چھپ چھپا کر آنکھیں لڑائی گئی ہوں، کتابوں کاپیوں میں چھپا کر چٹھیاں بھیجی گئی ہوں، اس سے شادی ہو گئی ہو۔ مستقبل میں بھی ایسا ہونے کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے یوسف درزی کی لڑکیاں اسکول جاتے جاتے یا اپنے گھر کی کھڑکی دروازے پر کھڑے ہو کر بے

خیالی میں لڑکوں کو دیکھ کر مسکرادیتیں یا آنکھیں نیچی کر کے تیزی سے بغل سے نکل جاتیں۔

آج بھی کرفیو لگنے سے پیدا ہوئی بوریت کو دور کرنے کے لیے وہ لڑکیاں باری باری سے کھڑکی پر آکر بیٹھ جاتیں اور نیچے گلی میں چبوترے پر بیٹھے لڑکوں کی سیٹیوں اور پھبتیوں پر مسکرا کر ہٹ جاتیں۔ یوسف درزی کا پشتینی مکان اس محلے کے مکانوں کے لحاظ سے کافی بڑا تھا، نیچے دو کمرے تھے، آنگن تھا اور باورچی خانہ۔ اوپر ایک کمرہ تھا اور کھلی چھت تھی، چھت کی دیواریں ضرور یوسف نے اپنی لڑکیوں اور دنگوں کی وجہ سے کافی اونچی کرادی تھیں۔

پورا گھر سہا ہوا اور سناٹے میں تھا، یوسف اور اس کی بیوی نے باہری دروازہ بند کر کے اس پر تختے اور چارپائیاں کھڑی کر کے مضبوطی کر دی تھی۔ یوسف کرفیو لگتے ہی بڑی مشکل سے گرتا پڑتا اپنی دکان بند کر کے گھر آیا تھا۔ وہ کافی دیر تک گھر کے دروازے بند کر کے اوندھے منہ بستر پر پڑا رہا۔ اس کی بیوی دبے لفظوں میں اسے کوستی رہی۔ لڑکے لڑکیاں سہمے سہمے کونوں کھدروں میں دبکے رہے۔ اندھیرا ہونے پر لڑکیاں باری باری سے اوپر کمرے میں کھڑکی تک آنے جانے لگیں۔ ماں نے کھانا پکانا شروع کیا اور لڑکیوں میں سے دو ایک کو دھول دھپے لگا کر اپنے ساتھ رسوئی میں لگالیا۔ باپ بیچ بیچ میں ذرا بھی شور ہونے پر دانت پیس کر لڑکوں کو گالیاں دیتا۔

کھانا بن جانے پر یہ سلسلہ ٹوٹا اور پورا خاندان نیچے اکٹھا ہو کر کھانا کھانے بیٹھا۔ بیوی پروستی رہی اور یوسف درزی اپنی عادت سے مجبور سر جھکائے کھاتا رہا۔ بچے بھی اس کی موجودگی سے خائف ہو کر خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اس بیچ باہر چبوترے پر بیٹھے لڑکوں کا صبر جواب دے گیا۔ انہوں نے پہلے تو ایک آدھ کنکریاں اوپر کھڑکی پر پھینکیں اور جب کوئی لڑکی کھڑکی پر نہیں آئی تو تین چار ادھے اور پوری اینٹیں دروازے پر دے ماریں۔

دروازے پر اینٹ لگتے ہی جو بھڑ بھڑ کی آوازیں ہوئیں انہوں نے یوسف درزی کے پورے خاندان کو خوف کے سمندر میں ڈبو دیا۔ چھوٹے بچوں نے رونا شروع کر دیا، یوسف نے دہشت بھری آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر

چارپائیاں رکھی تھیں، لیکن پھر بھی اگر باہر سے دباؤ پڑتا تو پرانے وقت کی مار کھایا دروازہ کتنی دیر تک رک پاتا۔ اس نے اپنے چھوٹے لڑکے کو کچھ اشارہ کیا اور اس نے کھڑکی بند کردی۔ یوسف اور اس کی بیوی نے دو تین بھاری سامان اٹھا کر دروازے سے لگادیئے، بچوں کے نوالہ نگلتے ہاتھ رک گئے اور انہوں نے اپنی خوف زدہ آنکھیں دروازے پر جمادیں۔

باہر گلی میں بھی اینٹوں کی آوازوں نے لوگوں کو کچھ دیر کے لیے تہہ وبالا کردیا، لیکن جلد ہی لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ کوئی باہری حملہ نہیں تھا بلکہ گلی کے ہی لڑکوں نے یوسف درزی کے مکان پر پتھر پھینکے تھے۔

لوگوں نے لڑکوں کو گالیوں سے جھڑکا۔ جو لوگ دوسری گلیوں کے مسلمانوں کے یہاں پاکستانی ٹرانس میٹر اور ہتھیاروں کا ذخیرہ ہونے کا بیان کررہے تھے، انہیں کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ کیسے اپنی گلی کے مسلمان کے مکان پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ساتھ اتنے لوگ للکارنے لگے کہ شرارتی لڑکے سہم کر دبک گئے۔

گلی والوں کو بھی احساس ہوا کہ افراتفری میں اس اکیلے مکان کو وہ بالکل بھول گئے تھے۔ وہ مکان کے سامنے اکٹھے ہوگئے۔ دو تین نے الگ الگ آوازیں لگا کر یوسف کو دروازہ کھولنے کو کہا۔ اندر سے کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔

''آج پہلا دن ہے، آج دروازہ نہیں کھولیں گے۔'' کسی نے کہا۔ بات صحیح تھی کیوں کہ پہلے بھی کرفیو کے دوران دو ایک دن تک یوسف کے گھر کا دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ ''یوسف بھائی گھبرانا نہیں، ہم لوگ یہاں ہیں۔'' دیوی لالہ نے اپنی شراب کی پیاسی کرخت زبان کو دباتے ہوئے کہا۔ لڑکوں نے وہ بات پکڑ لی۔ انہوں نے چلبلی آواز میں گانا شروع کیا۔

یوسف تم سنگھرش کرو ہم تمہارے ساتھ ہیں

ابھی ابھی چناؤ ختم ہوا تھا اور نعرہ لڑکوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ بڑوں نے انہیں جھڑکنے کی کوشش کی لیکن ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ لوگ الگ الگ گروہوں میں تتر بتر ہوگئے۔

تھوڑی دیر میں اوپر والی کھڑکی کھل گئی اور لڑکے بھی نیچے سامنے والے چبوترے پر جم گئے۔

4

کرفیو کا دوسرا دن تھا اور سعیدہ کی ہمت پوری طرح پست ہوگئی تھی۔ اگست کی سڑی گرمی نے مسلسل بند کمرے کو جہنم میں تبدیل کردیا تھا۔ اس جہنم میں گھری عورتوں اور مردوں کے جسموں کی بو کے ساتھ بچوں کے پاخانے کی بدبو بھی شریک ہوگئی تھی۔ 13 ضرب 8 فٹ کے کمرے اور اس سے متصل 8 ضرب 5 فٹ کے برآمدے میں لوگ قید تھے۔ اس میں سعیدہ، اس کا شوہر، اس کی ساس اور سسر، اس کی ایک بڑی نند، دو چھوٹے دیور ایسے تھے جنہیں بڑا کہا جاسکتا ہے۔ اس کی نند کا سات سال کا لڑکا اور اس کی دو بیٹیاں، تین ذی روح ایسے تھے جن کی گنتی چھوٹوں میں ہوسکتی تھی۔

اپنے گاؤں سے جب سعیدہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو بہت ساری چیزوں سے وہ مانوس نہیں ہو پائی تھی۔ وہ محلّہ جسے منہاج پور کے نام سے پکارا جاتا تھا، خاص طور سے مسلمانوں کا محلّہ تھا اور اکثر مسلم محلوں کی طرح غریبی، گندگی اور جہالت سے لبریز رہتا تھا۔ بڑی مشکل سے سعیدہ یہ بات سمجھ پائی کہ یہ چھوٹا سا کمرہ اس کا پورا گھر ہے۔ اس کمرے میں ساس، سسر، دیور اور نند کی موجودگی میں اسے اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کرنی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ چڑ جاتی تھی۔ ایک کمرے کے اس گھر میں پیچھے کی طرف ایک برآمدہ تھا، جس سے ملا ہوا چھوٹا سا پاخانہ تھا۔ اس پر ایک ٹاٹ کا پردہ ٹنگا رہتا تھا اور کمانے والا نہ ہونے کی وجہ سے کبھی بھی یہ پوری طرح سے صاف نہیں ہوتا تھا۔ ایک خاص طرح کی بدبو اس سے ہمیشہ نکلتی رہتی تھی۔ سعیدہ کو اس بدبو کے ساتھ جینے کی عادت ڈالنے میں کئی مہینے لگ گئے۔

اسی برآمدے میں سعیدہ کو شادی شدہ زندگی کا ابتدائی سکھ حاصل ہوا۔ پہلی رات کو چھوڑ کر، جب اس کے ساس، سسر سبھی کو لے کر باہر گلی میں نالے پر سونے چلے گئے تھے۔ باقی تقریباً روز ہی کوئی نہ کوئی کمرے میں موجود رہتا۔ کبھی کبھی تو پورا کنبہ ہی اندر موجود رہتا۔ سعیدہ کا شوہر برآمدے میں زمین پر بستر بچھا کر پڑا رہتا اور بے چینی کے ساتھ سعیدہ کا انتظار کرتا۔ وہ دیر ہونے پر مضحکہ خیز انداز میں کھانستا اور اس کی کھانسی کی آواز سن کر سعیدہ کا بدن کاٹھ کی طرح تن جاتا۔ اسے شوہر کی بے حیائی پر بے حد غصہ آتا اور اس کا غصہ تب تک رہتا جب تک وہ دھیرے سے اٹھ کر زمین پر پورے کمرے میں سوئے لوگوں کو لانگھتی پھلانگتی اپنے شوہر کی بغل میں جا کر لیٹ نہ جاتی۔

کرفیو کا دوسرا دن تھا اور سعیدہ کو چھوڑ کر گھر کے باقی سبھی افراد کو معلوم تھا کہ ابھی اگلے کئی دنوں تک اس میں چھوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ شہر کے حکام کبھی کبھی سبق سکھانے کے لیے کرفیو کئی دنوں تک نہ ہٹانے کے اصول پر یقین رکھتے تھے اور جب انہیں یہ اطمینان ہو جاتا کہ انہوں نے کافی سبق سکھا دیا ہے تبھی وہ کرفیو ہٹاتے۔

بند کمرے میں پڑے رہنے سے سعیدہ کو دو دقتیں محسوس ہو رہی تھیں، ایک تو اس کی بٹیا کی بیماری تھی جس کو دیکھ کر اس کی قیافہ شناس ساس کو لگ رہا تھا کہ اس کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ اس کی ساس نے گیارہ بچے پیدا کئے تھے جن میں سے سات مر چکے تھے۔ بچوں کو مرتے دیکھنے کا اسے کچھ ایسا تجربہ تھا کہ اسے اب کسی بھی مرتے ہوئے بچے کو دیکھ کر اس کی ہونے والی موت کا احساس ہو جاتا تھا۔ سعیدہ کی دوسری دقت بڑی عجیب قسم کی تھی۔ وہ جس ماحول سے اس شہر میں آئی تھی وہاں اس طرح کی دقت کا خیال بھی اس کے لیے مضحکہ خیز تھا۔ وہاں روز صبح منہ اندھیرے المونیم کا لوٹا ہاتھ میں لیے اپنی کسی بہن یا پڑوسن کے ساتھ وہ دور کھیتوں میں نکل جاتی۔ اس کے گاؤں میں دو ایک زمیندار گھروں کو چھوڑ کر باقی کسی کے گھر میں پاخانہ نہیں تھا۔ عورتیں صبح شام اندھیرے میں کھیتوں میں چلی جاتی تھیں۔ جن دنوں کھیت خالی ہوتے ان دنوں وہ کسی چھوٹی موٹی جھاڑی یا اونچی مینڈ کے پیچھے چھپ جاتی تھیں۔ اس عادت میں تبدیلی بھی آتی تھی، جب بارش پڑتی تھی یا کسی کا پیٹ خراب ہو جاتا تھا۔

سعیدہ کی ساس نے اسے پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ یہاں اسے کیا کرنا پڑے گا۔ اس کے ساس سسر دیہات سے آکر اس گلی میں بسے تھے، اس لیے اس کی ساس جانتی تھی کہ گاؤں سے پہلی بار آنے پر عورت کے سامنے کیا کیا دقتیں آسکتی ہیں۔ پہلی ہی شام سعیدہ گھر کے سنڈاس میں گئی تو الٹیاں روکتے روکتے اس کا برا حال ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے بری طرح پانی بہنے لگا تھا اور کھٹی پت بھری رال اس کے ہونٹوں کے کونوں سے رس رس کر اس کے کپڑے بھگو گئی۔ سنڈاس 6 ضرب 3 فٹ کا کمایا جانے والا پاخانہ تھا، جس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ اس میں مشکل سے کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ اندھیرے سیلن بھرے اس کمرے میں ایک تیز بو ہر وقت اٹھتی رہتی تھی اور اس کا دروازہ کھلتے ہی یہ بدبو پورے گھر پر بھپکے کی طرح چھا جاتی تھی۔ دروازہ بند ہونے پر بھی گھر کے پورے جغرافیے پر یہ بدبو ایک دھیمے غلاف کی طرح چھائی رہتی تھی۔ اس بدبو کے ساتھ جینے کے لیے اس سے واقف ہونا ضروری تھا اور یہ واقفیت حاصل کرنے میں سعیدہ کو مہینوں لگ گئے۔

سنڈاس دن میں ایک بار صاف ہوتا تھا۔ سعیدہ نے شروع میں چالاک بننے کی کوشش کی۔ صبح ساڑھے سات بجے تک بھنگی آجاتا تھا۔ کچھ بولے بغیر دروازے کے باہر سیڑھیوں پر وہ خاص ڈھنگ سے جھاڑو پٹختا۔ جھاڑو کی آواز اس کے آنے کا اشارہ تھی اور اس آواز پر سعیدہ کا دیور یا ساس اٹھ کر دیکھ آتی کہ پاخانے میں کوئی گیا تو نہیں ہے۔ اس میں کسی کے ہونے یا اس کے خالی ہونے کی اطلاع بھنگی کو دے دی جاتی۔ پاخانے کی صفائی کے لیے پیچھے گلی میں جانا پڑتا تھا جہاں پاخانے کے نیچے کا قریب قریب ایک مربع فٹ چھوٹا سا حصہ کھلتا تھا۔ اسے ڈھکنے کے لیے ٹین کا ایک ٹکڑا کیلوں کے سہارے جڑا ہوا تھا۔ وقت کی مار نے اس ٹین کے ٹکڑے کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ بھنگی کو روز اس ٹین کے ٹکڑے کو کھولنے یا بند کرنے میں یہی ڈر لگتا تھا کہ دوسرے دن یہ ٹکڑا اسے صحیح سلامت ملے گا بھی یا نہیں۔ سعیدہ نے پانچ سات ہی دن میں بھنگی کے معمولات سمجھ لیے۔ وہ صبح ہی سے دھیان لگا کر بیٹھی رہتی اور جیسے ہی بھنگی صفائی کر کے ہٹتا وہ سنڈاس کی طرف لپکتی۔ دقت صرف اتنی تھی کہ اسے روز بہت سویرے پاخانے

جانے کی عادت تھی۔ صبح سات ساڑھے سات بجے تک انتظار کرنا کافی تکلیف دہ محسوس ہوتا تھا۔ اپنے اوپر قابو رکھنے کے لیے اسے طرح طرح کی حرکتیں کرنی پڑتی تھیں۔ اکثر اس کا پورا جسم اکڑ جاتا۔ جلد ہی اس کی ساس نے اس کی یہ حرکت پکڑ لی، اس کی ساس کو یہ بہت برا لگا کہ چار دن پہلے گھر میں آئی لونڈیا اپنے کو خاندان کے دوسرے لوگوں سے برتر سمجھے اور ایسا برتاؤ کرے جس سے دوسرے لوگ اپنے کو کمتر سمجھیں۔ اس نے ایک دن صبح صبح سعیدہ کو ایسی چنی چنی گالیاں دیں کہ وہ شرم اور گھبراہٹ میں کافی دیر تک اپنے پیروں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔

لیکن اس کی ساس، جو اس کی ساس کے علاوہ پھوپھی بھی تھی، جلد ہی پسیج گئی۔ اس نے دو تین بار دیکھا کہ سعیدہ ابتر حالت میں سنڈاس سے نکلتی۔ اس کی آنکھوں سے بری طرح پانی نکلتا رہتا اور الٹی روکنے کی کوشش میں اس کے منہ سے رال کی شکل کا مادہ گرتا رہتا۔

سعیدہ کے گھر کے پاس جہاں گلی ختم ہوتی تھی وہاں ایک پلاٹ خالی پڑا تھا، اسے کسی نے گھر بنوانے کے لیے نیو بھروا کر پچھلے کئی برسوں سے خالی چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے پیچھے نالا تھا جو کافی دور تک گلی کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا شمال کی طرف نکل جاتا تھا۔ یہ پلاٹ اور نالا دن بھر محلے کے بچوں کی آوارہ گردی اور کھیل کود کا اڈا بنا رہتا۔ سعیدہ کی ساس صبح منہ اندھیرے اسے لے کر اسی میں جانے لگی۔ کبھی وہ پلاٹ کے کسی کونے میں بیٹھ جاتی اور کبھی نالے کے کنارے چلی جاتی۔ نالے کے کنارے اترنے کے لیے ڈھلان سے اترنا پڑتا تھا، اس لیے اکثر ساس بہو ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے کو سہارا دیتیں۔ بڑھیا ساس ایک دو بار گر کر اپنے ٹخنوں میں موچ بھی لگا بیٹھی۔ ہر بار گرنے پر وہ سعیدہ کو کوستی اور بیٹھے بیٹھے یا چلتے چلتے اتنی گالیاں دیتی کہ سعیدہ روہانسی ہو جاتی۔

اس پورے معمول میں دقت یہ تھی کہ ساس بہو کو صبح بہت سویرے اٹھنا پڑتا۔ انہیں کسی رات گیارہ بجے سے پہلے سونا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ سعیدہ کو تو اس کے بعد بھی اپنے شوہر کے لیے ایک آدھ گھنٹے تک جاگنا پڑتا۔ اس کے بعد اتنے سویرے اٹھنے کا مطلب تھا پورا دن اونگھتے ہوئے بتانا۔ ساس نے تو پانچ سات ہی دن میں توبہ بول دی، مگر

سعیدہ کو اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔ سنڈاس میں بیٹھنے کا خیال ہی اتنا ابکائی بھرا تھا کہ وہ روز صبح صبح مقررہ وقت پر اٹھ بیٹھتی۔ کبھی شوہر رات کو دیر تک سونے نہ دیتا تو باقی تین چار گھنٹے سعیدہ کے اس دہشت میں نکل جاتے کہ کہیں سورج نکل آئے اور اس کی آنکھ نہ کھلے۔ وہ نیم غنودہ حالت میں رہتی اور بیچ بیچ میں چونک کر اٹھ جاتی اور اپنے شوہر کی کلائی میں آنکھیں گڑا گڑا کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی۔ رات بھر وہ اسی طرح سوتی اور دن بھر ساس کی گالیاں سنتی۔

کرفیو کے دوسرے دن گھر، ابلتے سنڈاس اور امس بھری گرمی میں ایک ایسے دوزخ میں تبدیل ہوگیا جس میں زندہ رہنے والے افراد کے لیے پسینے اور بدبو سے پست وجود کو ڈھونا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ سعیدہ نے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر اندر گھسنے کی کوشش کی اور تقریباً قے کرتی ہوئی باہر بھاگی۔ پورا دن ہوگیا تھا اور وہ ایک بار بھی سنڈاس نہیں گئی تھی۔ صبح سے وہ کچھ نہیں کھا رہی تھی، مارے ڈر کے اس نے چائے بھی نہیں پی تھی۔

سعیدہ کی لڑکی دن بھر اپنی دادی کی گود میں پڑی رہتی تھی۔ دو سال کی لڑکی تین دن کی پیچش سے بے حال ہوگئی۔ آج دوپہر بعد سے اسے الٹیاں بھی شروع ہوگئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ سڑی گرمی اور گندگی نے اسے ہیضے کا شکار بنا دیا ہے۔ صرف دادی اور ماں اس کے بارے میں پریشان تھیں۔ دادا اور باپ کمرے کے ایک کونے میں اکڑوں بیٹھے بیڑیاں بنانے میں اس قدر مشغول تھے کہ اس اندھیرے سیلن بھرے کمرے میں اچانک کوئی روشنی میں سے آتا تو انہیں بھوت سمجھنے کی بھول کر بیٹھتا۔ چاروں طرف سے بند کمرے میں ان کے ننگے بدن پر پسینا بری طرح بہہ رہا تھا اور ان کے پیشہ ور ہاتھ پتوں، تمباکو اور دھاگوں پر مضراب کی طرح چل رہے تھے۔ سعیدہ کے دونوں دیور اور اس کی نند کا لڑکا کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھے کیرم بورڈ کھیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر میں یہی ایک تفریح کا سامان تھا اور صبح سے اسے کھیلتے کھیلتے لڑکے بور ہوگئے تھے۔ وہ کھیلتے، جھگڑتے، کھیلنا بند کر دیتے اور پھر کھیلنے لگتے۔ صبح سے یہی چل رہا تھا، آج چوں کہ بیڑی بنانے کا سامان کم تھا اس لیے انہیں کھیلنے کے عوض میں لاتیں، گھونسے یا

گالیاں نہیں مل رہی تھیں۔ ڈیڑھ کمرے کے مکان میں صرف سعیدہ کی نند چل پھر رہی تھی اور گھر کے لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنے میں لگی تھی۔

سعیدہ دو دن کے لیے دوا لائی تھی اور گھبراہٹ میں اس نے ایک ہی دن میں اسے پلائی تھی۔ دوپہر تک دوا ختم ہوگئی۔ سعیدہ نے کئی بار مجبور اور لاچار نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ایک آدھ بار اس نے اپنے سسر کا لحاظ چھوڑ کر شوہر سے باہر جاکر دوا لانے کی گڑگڑاہٹ بھری خوشامد بھی کی، لیکن اس کا شوہر اور سسر بے حسی سے اپنے کام میں لگے رہے۔

شوہر کو سویرے بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ اس لیے اب وہ باہر جانے کی کوئی التجا سننے کو تیار نہ تھا۔ صبح پانی کے لیے اسے باہر نکلنا پڑا تھا، گھر میں ایک نل تھا جس میں صبح اور شام کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پانی بوند بوند ٹپکتا تھا۔ پانی کی باقی ضرورت گلی کے منہ پر لگے عام نل سے پوری ہوتی تھی۔ روز صبح اور شام وہاں کہرام مچتا تھا۔ عورتیں ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی، اپنی اپنی بالٹی کو آدھا تہائی بھرتی تھیں۔ گلی کے زیادہ تر مکانوں میں ایک دو ٹونٹیوں سے زیادہ نہیں تھیں، جن سے جاڑوں میں بھی لوگوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ پھر اس وقت تو بلا کی گرمی تھی جس میں آدمی کے حلق میں ہر وقت کانٹے لگے رہتے ہیں۔ اس لیے سعیدہ کے شوہر نے اپنی ماں کے کہنے پر جوکھم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ پچھلے دن دوپہر میں کرفیو لگنے کے بعد سے ایک بوند پانی باہر سے گھر میں نہیں آیا تھا۔ گھر کے نل میں روز کی طرح اتنا پانی ٹپکا تھا کہ سویرا ہوتے مشکل سے ڈیڑھ بالٹی پانی بچا تھا۔ اس لیے ماں کے کہنے پر وہ بالٹی ہاتھ میں لیے باہر گلی کے ٹھنڈے اندھیرے میں اتر گیا۔

تقریباً بارہ گھنٹے امس بھرے کمرے میں بند رہنے کے بعد کھلے پن میں نکلنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ ابھی پو نہیں پھٹی تھی اور گرمی کی صبح ٹھنڈی بیار کے ساتھ تازگی دے رہی تھی۔ پوری گلی میں سناٹا تھا اور رات میں گلی کے ایک ایک انچ میں پڑی رہنے والی چارپائیاں جانے کہاں رخصت ہوگئی تھیں۔ روز کی تنگ گلی آج کافی کھلی اور چوڑی نظر آرہی تھی۔ زندہ ہستیوں کے نام پر صرف کتے تھے، روز رات بھر گلی میں جگالی کرتی

گھومنے والی گائیں بھی کرفیو کی زد میں آگئی تھیں اور لاپتا تھیں۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بالٹیاں لٹکائے سہمی سہمی چال سے آگے بڑھا۔ نل قریب سو گز دور تھا، تھوڑا ہی آگے بڑھنے پر پانی کی آواز آنے لگی۔ نل کھلا ہوا تھا اور صبح صبح تیز رفتار سے پانی آنے کی وجہ سے اس کے زمین پر گرنے کی آواز یہاں تک آرہی تھی۔ روز ہی کی طرح رات میں نل بند نہیں کیا گیا تھا اور روز ہی کی طرح پانی تیز رفتار سے زمین پر گر رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ روز اس وقت تک اکا دکا عورتیں بالٹیاں لیے نل کی طرف جاتی یا واپس آتی دکھائی دے جاتی تھیں جب کہ اس وقت وہ بالکل اکیلا تھا۔

دس پانچ قدم چلنے کے بعد اس کا ڈر دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا۔ وہ مستی میں آنے لگا۔ رات بھر کی بے کیفی نے اس کے جسم میں جو اکڑن بھر دی تھی، صبح کی ٹھنڈی بیار نے اسے دور کر کے تازگی پیدا کر دی۔ وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگا۔ اپنے آپ سے بے خبر جب وہ نل کے قریب پہنچا تو اسے یہ بھی پتا نہیں کہ وہ اونچی آواز میں گا رہا ہے۔ اس نے نل کے نیچے بالٹی لگانے سے پہلے پانی کی ٹھنڈی دھار اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی اتنی تیز رفتار سے آرہا تھا کہ لاکھ بچاتے بچاتے اس کی لنگی اور بنیان بھیگ گئے، پانی ٹھنڈا تھا اور اس کا لمس تن میں سکھ اور جھرجھری ایک ساتھ پیدا کر رہا تھا۔

پتا نہیں اس کی اونچی آواز کا اثر تھا یا صبح صبح ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھونے کا۔ ایک دو پولیس والے اونگھتے اکساتے وہاں نمودار ہوئے۔ اسے ان کے وہاں ہونے کا پتہ تب چلا جب انہوں نے گالیوں اور ڈنڈوں کی بوچھار ایک ساتھ شروع کر دی۔ ''مادر... سالے، کرفیو میں یہاں اپنی ماں ...'' اس جملے کے ساتھ دنادن اس کے پیروں اور کولہوں پر ڈنڈے پڑنے لگے۔

اس کی دوسری بالٹی آدھی بھری تھی، وہ لڑکھڑا کر ایک طرف کو جھکا اور پھر سنبھل کر اس نے دونوں بالٹیاں اٹھائیں اور گھر کی طرف بھاگا۔ دونوں پولیس والے شاید رات بھر ڈیوٹی دینے کے بعد اتنے تھک چکے تھے کہ انہیں اس کے پیچھے بھاگنے میں کوئی نتیجہ

نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ نل میں لگا کر پانی پینا شروع کر دیا اور دوسرا کھڑا ہوا اسے ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا۔ بھاگتے بھاگتے وہ دو تین بار لڑکھڑایا۔ جگہ جگہ اس کی بالٹیوں کا پانی چھلکتا رہا اور راستے بھر اسے ایسا لگتا رہا جیسے اس کے پیچھے یم دوت دوڑتے چلے آ رہے ہوں۔ جب وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو اس کی دونوں بالٹیوں میں دو دو چار چار لوٹے پانی بمشکل رہ گیا تھا۔

اس لیے سعیدہ کے کئی بار اشارے سے اور کئی بار صاف صاف کہنے کے باوجود اس کے دل میں باہر نکل کر لڑکی کے لیے دوا لانے کا کوئی جوش پیدا نہیں ہوا۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں لگا رہا۔

سعیدہ نے بھی جھنجھلا کر اپنے شوہر سے بولنا بند کر دیا۔ بیچ بیچ میں جب اس کی بیٹی اپنی دادی کے اوپر الٹی یا دست کر دیتی تو وہ اٹھتی اور پانی کے ساتھ پوری کنجوسی برتتے ہوئے ساس کی ساڑھی یا بدن پونچھ دیتی۔ اس کی ساس نے کئی بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دھیرے دھیرے مرتے دیکھا تھا، اس کے لیے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں تھا کہ یہ بچی بھی اب مر رہی ہے۔

چھوٹی سی بچی کو مرتے ہوئے دیکھنا بطور ماں کے سعیدہ کا پہلا تجربہ تھا۔ اس نے شہر میں آ کر کئی فلمیں دیکھی تھیں جن میں اکثر عورتیں اپنے مرحوم بچوں کی یاد میں گانے گاتیں اور بچوں کی بھولی شرارتوں کے تصور میں ڈوبی رہتیں۔ سعیدہ نے اپنی بٹیا کی شرارتیں یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے ہر بار مایوسی ہوئی۔ جو چیز اسے یاد آ رہی تھی وہ بھوک، دھول اور بہتی ناک کا کچھ ایسا ملا جلا ملغوبہ تھا جس سے فلمی ماں کی مکمل حقیقت کا کوئی ماحول نہیں بن پا رہا تھا۔ اسے بار بار یاد آ رہا تھا۔ اس بٹیا کی پیدائش پر اس کی چھاتیوں میں دودھ نہیں اترا تھا۔ سال بھر کی اس کی پہلی بیٹی ابھی تک اس کی چھاتی بھنبھوڑتی تھی لیکن اس بیٹی کے جنم سے کچھ دن پہلے سے اس کی ساس نے بڑی بیٹی کو ڈانٹ پھٹکار کر یہ عادت چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ بڑی بیٹی روتی رہتی اور وہ چھوٹی کو اپنی چھاتیوں سے چپکائے رہتی۔ دودھ پتا نہیں اس بار کیوں نہیں اتر رہا تھا۔ لاچاری، غریبی اور مشقت سے ٹوٹا ہوا اس کا بدن، اسے پوری طرح سے ماں بننے سے روکتا تھا۔

وہ جھنجھلا کر اپنی دونوں بیٹیوں کو زمین پر ساتھ ساتھ لٹا دیتی اور خود گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ دونوں بیٹیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر روتیں اور روتے روتے بے دم ہو جاتیں۔ گھر کے ذی روح سر جھکائے بیڑی بناتے رہتے، بچوں کا اس طرح رونا اس گھر کے ماحول میں ایسی جانی پہچانی صورت حال تھی کہ انہیں اپنا کام چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

آج یہی بٹیا مر رہی تھی، زندگی کا سب سے بڑا دکھ ماں کی گود میں اس کے بچے کی موت ہے۔ سعیدہ کا پور پور ماں بن گیا تھا اور نوحہ کر رہا تھا۔ اس کی ایک کمزور اور غریب بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے مر رہی تھی اور کچھ نہ کر پانے کا احساس اسے بری طرح تڑپا رہا تھا۔ اسے گردن جھکائے، لاتعلق سا، بیڑی بناتا ہوا اپنا شوہر ظالم راکشس سا لگ رہا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ چیخ چیخ کر کمرے کے سناٹے کو توڑ ڈالے اور پتھر کی طرح سخت اور بے حس اپنے شوہر کا سینہ اپنے نکیلے ناخنوں سے چھلنی کر ڈالے۔

جس طرح خاموش کالے پانی والی جھیل کا سناٹا اس میں پتھر گرنے سے ٹوٹتا ہے، اسی طرح اس گرم اُمس والے کمرے کی خاموشی سعیدہ کی چیخ سے ٹوٹی اور کمرے کا ماحول پانی کی طرح دیر تک کانپتا رہا۔ بٹیا کی آنکھیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں اور ہچکی کے ساتھ سانس اکھڑنے لگی تو اس کی دادی سمجھ گئی کہ اب اس کا وقت پورا ہو گیا ہے۔ لیکن ماں کی سمجھ میں یہ تب آیا جب اس نے بٹیا کے منہ کے کونے سے بہتی رال اور الٹی کے گھول کو پونچھنے کی کوشش کی اور اسے اوپر جھکے جھکے دیکھا کہ بچی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں عجیب طرح سے جھپک رہی ہیں اور اس کی دونوں آنکھوں کے دیدے اوپر کی طرف چڑھتے چڑھتے اچانک جامد ہو گئے۔ اسے ایک ناقابل برداشت گھبراہٹ اور ڈر اپنی پسلیوں میں دوڑتا محسوس ہوا اور وہ چیخ پڑی۔

سعیدہ کے شوہر کے لیے موت ایک بہت معمولی قسم کی چیز تھی، اس کے اپنے گھر اور پڑوس میں ہر سال موت کسی نہ کسی کو اپنے جبڑے میں کس لیتی تھی۔ مرنے والوں میں اکثر چھوٹے بچے ہوتے تھے۔ لیکن اپنی بچی کی موت میں پتا نہیں کیا تھا کہ ضبط کا

سارا ناٹک کرنے کے باوجود سعیدہ کی پہلی چیخ سن کر وہ ہل گیا۔ جس بیٹی کو دو سال میں مشکل سے چار چھ بار گود میں لے کر باپ کی طرح پیار کیا تھا، اس کے مرنے پر وہ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا خلا میں گھورتا رہا۔ ماں کی موجودگی اسے رونے سے روک رہی تھی، روتی ہوئی سعیدہ زمین پر سر پٹخنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساس اور نند اسے پوری طرح سے جکڑے ہوئے تھیں، لیکن پھر بھی بیچ بیچ میں اس کا سر دیوار یا فرش سے ٹکرا جاتا شوہر کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر بیوی کا سر سہلا دے۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور پیچھے کے برآمدے میں بیٹھ کر رونے لگا۔ شاید وہ اپنی بیمار بچی کے لیے کچھ نہ کر پانے کا گناہ گار تھا جس نے اسے رونے پر مجبور کر دیا۔

5

لڑکی کی عمر چودہ سال رہی ہوگی۔ نام بتانے سے قارئین کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہونا ہے۔ نام کے ساتھ مذہب جڑا ہوتا ہے اور ہمارے اس مہان جگت گرو دیش میں مذہب کبھی انا کی تسکین کی وجہ ہوتا ہے تو کبھی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا بہانہ بن سکتا ہے۔ مثلاً یہ لڑکی اگر مذہباً ہندو نکلی تو ہندو دلاوروں کے لیے ڈوب مرنے کی بات ہوجائے گی اور اگر مسلمان نکلی تو اسلام خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اس لیے اے قارئین بہتر ہے کہ ہم اس لڑکی کو ہندو یا مسلمان نہ مانیں اور اس کی مصیبت کو صرف اس کی ذاتی مصیبت مان لیں۔

یہ لڑکی اس ملک کی اکثر لڑکیوں کی طرح جہالت، غریبی اور خوابوں کے ساتھ جینے پر مجبور تھی۔ ہندی فلموں اور رانو کے ناولوں نے اس کے جذبات گڑھنے شروع کیے تھے اور وہ دن رات خوابوں میں ان راجکماروں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی جنہیں اس کی زندگی میں کبھی نہیں آنا تھا۔ اس لڑکی کی گلی کی نالیوں میں پاخانہ بہتا رہتا تھا اور صفائی تبھی ہوتی تھی جب کسی بڑے افسر یا وزیر کا معائنہ ہوتا تھا۔ اس لڑکی کی بڑی بہن بھی اس گندی گلی میں لمبی گاڑیوں والے راجکماروں کا تصور کرتی رہی تھی اور پچھلے سال گلی کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ ان لڑکیوں کے باپ اور بھائیوں نے اسے تیسرے ہی دن بمبئی کے ریلوے پلیٹ فارم پر پکڑ لیا اور پندرہ دن

کے اندر اسے ایک ایسے خلاصی سے بیاہ دیا گیا جس کی پہلی بیوی اپنے پیچھے تین بچوں کو چھوڑ کر پچھلے سال ہی مری تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ بھی یہی ہونا تھا لیکن اس کے باوجود یہ لڑکی عمر کی ماری گنگناتی رہتی تھی۔

روز کی طرح یہ لڑکی آج بھی ایک بجے واپس گھر لوٹ رہی تھی۔ وہ گیارہویں کلاس میں پڑھتی تھی اور اس کا اسکول گھر سے تین کلو میٹر دور تھا، صبح سات بجے سے اس کا اسکول شروع ہوتا تھا۔ شفٹوں میں چلنے کی وجہ سے جاڑا گرمی برسات، کبھی بھی یہ وقت بدلتا نہیں تھا۔ گھر سے وہ چھ بجے نکلتی تھی، گرمیوں میں تو یہ گوارا تھا، لیکن سردیوں میں اسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اکثر پہلا پیریڈ چھوٹ جاتا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ لازمی طور سے پونے چھ بجے نکل جاتی تھی۔ اس پابندی کے پیچھے پڑھائی میں اچانک پیدا ہونے والی دل چسپی نہیں تھی بلکہ وجہ کچھ اور ہی تھی۔

اس لڑکی کی گلی میں کچھ آگے چل کر ایک لڑکا رہتا تھا۔ لڑکا اس سے چار پانچ سال بڑا تھا اور کچھ چھیلا قسم کا تھا۔ سالوں سال ایک ہی گلی میں رہتے ہوئے بھی اس سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ایک دوسرے میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ہوا یہ کہ اس لڑکے کو انٹر پاس کرنے کے بعد اس کے باپ نے نوکری کرنے کی صلاح دی۔ لڑکے نے بی اے کرنے کی ضد کی تو باپ نے دھنائی کر دی۔ لڑکے نے دو تین دن کھانا پینا چھوڑ دیا۔ باپ نے اسے اپنی تنخواہ اور مہنگائی کا موازنہ سمجھا دیا۔ لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سات آٹھ دن بعد باپ نے ایک مقامی اخبار میں لڑکے کی تصویر چھپوائی اور نیچے لکھا کہ اس کی ماں سخت بیمار ہے اور وہ فوراً لوٹ آئے۔ لڑکا لوٹ آیا، باپ نے پھر پٹائی کی۔ لڑکا اس بار نہیں بھاگا اور اس نے چپ چاپ نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اس معاملے میں وہ اپنی عمر کے تمام لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت نکلا۔ بنا کسی سفارش کے نینی کی ایک فیکٹری میں صرف دو ہزار روپے رشوت دے کر اسے ٹائم کیپر کی نوکری مل گئی۔ رشوت دینے کے لیے اس کے

باپ نے دفتر کے کئی لوگوں سے ادھار لیا اور لڑکا اپنی پہلی ہی تنخواہ سے یہ قرض پاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لڑکی کے آج کل پابندی سے صبح پونے چھ بجے گھر سے نکلنے کے پیچھے یہ لڑکا اور اس کی نوکری تھی۔ لڑکے کو آٹھ بجے فیکٹری پہنچنا ہوتا تھا، اس لیے وہ چھ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ گھر سے سٹی بس اسٹاپ تقریباً ایک کلو میٹر دور تھا۔ یہ وہ راستہ تھا جس سے ہو کر لڑکی بھی اسکول جاتی تھی۔ ایک ہی راستے سے جاتے جاتے دونوں کی آنکھیں محاورے کی زبان میں لڑ گئیں۔ صبح صبح بھیڑ کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ اکا دکا کوئی بغل سے گزر جاتا۔ آنکھیں لڑانے کے لیے یہ بڑا موزوں وقت ہوتا تھا۔ دو ایک دن تو لڑکی نے دھیان نہیں دیا، لیکن ایک دن اچانک اسے لگا کہ اس کے آگے چلنے والا لڑکا جان بوجھ کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل رہا ہے تاکہ وہ اس کے برابر آجائے۔ لڑکی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے رفتار دھیمی کرنی ہے یا تیز۔ لڑکے کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا بدن تھرتھرانے لگا اور جاڑے کی اس صبح اس کی کنپٹی گرم ہوگئی۔

لڑکی نے اپنی رفتار دھیمی کردی۔ لڑکے نے بھی اپنی رفتار اور دھیمی کردی۔ لڑکی سمجھ گئی کہ دوری کم ہونی ہی ہے۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی۔ لہٰذا دوری کم ہوگئی۔ پھر تو صبح صبح اٹھنے میں ہونے والی کاہلی ختم ہوگئی اور دونوں روز پابندی سے ایک کلو میٹر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

اس آدھے گھنٹے ہی میں دونوں نے خواب دیکھنے شروع کردیے۔ لڑکی بلا وجہ مسکرانے لگی اور لڑکا اپنے بالوں کو سنوارنے کے لیے اپنی پینٹ کی پچھلی جیب میں کنگھا رکھنے لگا۔ لڑکے کو کل چار سو نوے روپے تنخواہ کی صورت میں ملتے تھے۔ ان میں سے لگ بھگ سو روپے مہینے میں بس اور رکشا میں خرچ ہو جاتے تھے۔ باقی تین سو نوے روپے وہ لائق بیٹے کے طور پر اپنی ماں کے ہاتھ میں ہر پہلی تاریخ کو دے دیتا تھا۔ نوے روپے وہ اپنے جیب خرچ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس دوستی کے نتیجے میں اس نے اپنے جیب

خرچ میں کمی کی اور لڑکی کو ایک دن پکچر دکھا لایا۔ اسے ایک قلم بھینٹ کیا اور دو بار ریستوراں میں چائے پلائی۔ اس مہینے اس نے اپنی ماں کو سو روپے کم دیے اور بہانہ بنا دیا کہ اس کی جیب سے گر گئے۔ وہ لڑکی کو ایک شال بھینٹ کرنا چاہتا تھا۔ اسے دو تین مہینے ماں سے جھوٹ بول کر اتنے پیسے بچانے تھے کہ ان سے شال خریدی جا سکے۔ تب تک سردیاں بھی شروع ہو جائیں گی، اس نے اپنا ارادہ لڑکی کو بتا بھی دیا۔ لڑکی کو زندگی میں یہ پہلی شال ملنے جا رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر شال کا دباؤ اپنے سینے پر محسوس کرتی اور مسکرانے لگتی۔ اس نے اپنے گھر کے دو چار ناکارہ سویٹروں کو ادھیڑا اور لڑکے کے لیے سویٹر بننے لگی۔ ظاہر ہے کہ وہ ماں کو یہ نہیں بتا سکتی تھی۔ اس لیے یہ سب کارروائی چوری چھپے ہی ہوئی۔ ایک بڑی سی ٹوکری میں ماں ہر سال جاڑا ختم ہونے پر گھر بھر کے پھٹے چیتھڑے سویٹر سمیٹ کر رکھ دیتی تھی اور جاڑا شروع ہونے سے ایک آدھ مہینے پہلے ان سویٹروں کو ادھیڑ ادھیڑ کر دو تین سویٹروں کا اُون ملا کر ایک نیا سویٹر بنتی تھی۔ تقریباً ہر سویٹر کا اُون اس عمل سے اتنی بار گزرتا کہ پندرہ بیس دن پہننے کے بعد وہ پھر پھٹنے لگتا اور جاڑا ختم ہوتے ہوتے تار تار ہو جاتا۔ اس نے ڈھیرے سے ایک دن لڑکے کے ناپ کے سویٹر کے لیے ضروری اون ٹوکری میں سے نکال لیا اور اپنی سہیلی کے یہاں رکھ دیا۔ روز اسکول جاتے وقت راستے میں سہیلی کے یہاں سے اون لے لیتی اور پھر دن بھر بن کر واپس آتے وقت سہیلی کے یہاں رکھ دیتی۔

اس لڑکی کی زندگی اسی طرح محرومیوں اور رومانس کا مکسچر بن کر اگلے دو تین سال، جب تک اس لڑکے کے ساتھ فرار ہونے کا موقع نہیں آتا یا اس کی شادی نہیں ہو جاتی، چلتی رہتی اگر یہ کرفیو اس کے تجربات کی دنیا میں بھونچال بن کر نہ آ جاتا۔ ہوا یہ کہ پچھلے ایک ہفتے سے شہر کا مزاج گرم ہو رہا تھا۔ لڑکی کے ماں باپ تجربہ کار تھے اور جانتے تھے کہ مزاج کی یہ گرمی جلد ہی دنگے کی شکل میں برسے گی اور شہر کرفیو کی مار میں آ جائے گا۔ ماں نے رات ہی میں کہہ دیا تھا کہ صبح اسکول نہیں جانا، مگر لڑکی کے معمولات میں

اسکول کی بہت اہمیت تھی۔ دراصل غریبی کی ماری یہ لڑکی اسکول کے بعد کا پورا وقت اپنے گھر کو سنبھالنے میں لگاتی تھی۔ اس کی ماں ایک دکان دار کے لیے پیٹی کوٹ سیتی تھی۔ روز وہ لڑکی کے اسکول سے آتے ہی پیٹی کوٹ سینے بیٹھ جاتی اور آٹھ دس روپے کما لیتی تھی۔ لڑکی اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ گھر کا چوکا برتن سنبھال لیتی تھی۔ دیر رات تک گھر کے کام کاج کو ختم کرنے کے بعد وہ پڑھنے بیٹھتی۔ پڑھتی کیا، پڑھنے اور سوچنے میں لگی رہتی۔ اس اوبنے والے اور بے رس ماحول میں سویرے اسکول جانے کی وجہ سے جو تھوڑی بہت مٹھاس مل جاتی تھی اسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ماں کے منع کرنے کے باوجود سب کی آنکھیں بچا کر تیار ہوئی اور کب اسکول نکل گئی، گھر میں کوئی نہیں جان پایا۔

لڑکی کو بڑی کوفت ہوئی کہ لڑکا آج نہیں آیا۔ لڑکی کو لگا کہ اسے دیر ہوگئی، وہ پوری گلیاں لانگھتی ہوئی سڑک پر اس جگہ تک گئی جہاں لڑکا اپنی کمپنی کی بس پکڑتا تھا۔ وہاں پر روز کے مقابلے میں ایک تہائی لوگ بھی نہیں آئے تھے۔ لگتا تھا شہر کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے دفتر نہ جانا ہی مناسب سمجھا۔ بس آئی اور چلی گئی، لڑکی تب تک کھڑی رہی۔ لڑکا بزدل نکلا، اپنی ماں کے آنچل سے نکل نہیں پایا۔ لڑکی نے غصے اور بیزاری سے اس کی بزدلی کو کوسا اور واپس گھر جانے کے لیے مڑی، لیکن گھر جا کر کون ماں کے ہاتھوں ذلیل ہوتا، اس لیے وہ اسکول چلی گئی۔

اسکول میں بہت کم لڑکیاں اور استانیاں آئی تھیں۔ اس لیے کوئی کلاس نہیں چلی، کلاس میں لڑکیاں ادھم مچاتی رہیں اور پرنسپل کے کمرے میں بیٹھی استانیاں بار بار چائے منگاتی اور گپ لڑاتی رہیں۔ لڑکی نے کئی بار سوچا کہ گھر واپس چلی جائے، لیکن بیزاری اور ماں کے ڈر سے وہ کافی دیر اسکول کے میدان میں دھوپ میں بیٹھی اپنی ایک سہیلی سے دنیا بھر کی باتیں کرتی رہی۔ بات چیت کے اس عمل میں اس نے سنا زیادہ اور بولی کم۔

اچانک انہوں نے دیکھا کہ پرنسپل کے کمرے سے استانیاں بدحواس سی نکلیں اور

پھاٹک کی طرف بھاگیں۔ راستے میں جو بھی لڑکی انہیں ملی، انہوں نے اسے فوراً گھر جانے کی ہدایت کی۔ میدان کی طرف ایک چپراسی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے دور سے ہاتھ ہلا کر اور چلا کر گھر بھاگ جانے کے لیے کہا۔

ڈھوروں کی طرح ہر طرف سے لڑکیاں بھاگیں اور زیادہ تر کو گیٹ پر آنے کے بعد پتا چلا کہ شہر میں گڑ بڑ ہوگئی ہے اور کرفیو لگا دیا گیا ہے۔

حالانکہ لڑکی کا گھر ایسی گلی میں پڑتا تھا جہاں ہر سال دو سال میں کرفیو لگتا ہی رہتا تھا۔ پھر بھی کرفیو کے دوران سڑک پر بھاگنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بے تحاشہ بھاگی۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہو رہی تھیں، شٹروں کے گرنے کی آواز طلسمی دہشت پیدا کر رہی تھی۔ سائیکلوں پر اور پیدل بدحواس بھاگتے لوگوں کی بھیڑ، رگڑتی ٹکراتی، گرتی پڑتی، جس طرح دوڑ رہی تھی اس کا تصور بھی کسی دوسرے دن کرنے میں وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی، مگر آج کی دوڑ سے اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو بھر رہے تھے۔

جی ٹی روڈ پر تیسری گلی تھی جہاں سے لڑکی اپنے گھر کے لیے مڑتی تھی۔ آج اسے ہوش ہی نہ رہا اور بھیڑ کے ایک ریلے کے ساتھ وہ کسی دوسری گلی میں ڈھکیل دی گئی۔ گلی میں جب وہ گھسی تو ایک جتھے کا حصہ تھی، لیکن کسی طلسم کی طرح اچانک باقی لوگ نہ جانے کہاں غائب ہوگئے اور اس لڑکی نے دن دوپہر میں اپنے کو ایک ایسی گلی میں پایا جو پوری طرح ویران تھی، جس میں کھلنے والے سارے دروازے اور کھڑکیاں سخت جبڑوں کی طرح بھنچی ہوئی تھیں اور جس کے مکان دولت مند لوگوں کی طرح تھے۔ ان مکانوں میں یہی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ لڑکی گھبراہٹ کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس گلی سے وہ سیکڑوں بار گزری تھی، لیکن آج وہ نہ جانے کیسے اجنبی سی لگ رہی تھی۔

وہ ایک کونے میں کھڑی ہو کر زندگی کی علامات ڈھونڈنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر کی کوششوں کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ گلی کے مکان اتنے مردہ نہیں جتنے شروع میں لگے

تھے، ہر مکان میں کھڑکیوں دروازوں کے پیچھے چہرے سٹے ہوئے تھے اور بیچ بیچ میں کوئی پلا کانپتا اور اس کے پیچھے ڈری گھبرائی آنکھیں جھانکتی نظر آ جاتیں۔ گلی کے باہر جی ٹی روڈ پر کوئی شور ہوتا اور دروازوں کھڑکیوں کی درازیں ایک دم مند جاتیں۔ آس پاس کے کسی مکان کا دروازہ یا کھڑکی آواز کرتی اور لڑکی ڈری ہوئی ہرنی کی طرح چونکی ہو جاتی اور اس کی سانس تیز ہو جاتی۔

جن طاقت ور بانہوں نے لڑکی کو بے دردی سے اندر گھسیٹ لیا وہ پتا نہیں کہاں سے اگ آئی تھیں۔ لڑکی کو صرف ایک آواز شٹر اٹھانے کی سنائی دی اور جب تک وہ اس آواز کی دھمک سے چونکے، تب چھ مردانہ کھردرے ہاتھوں نے اسے ایک تنگ سے چھوٹے کمرے میں گھسیٹ لیا۔ یہ کمرہ ایک چکی کا کمرہ تھا جس میں آٹا پیسا جاتا تھا۔ اس میں چھپے ہوئے مردوں نے اچانک شٹر آدھا اوپر اٹھایا اور لڑکی کو اندر گھسیٹ لیا، گھسیٹے جانے کی ہڑبڑاہٹ میں لڑکی کا سر کھٹ سے شٹر سے ٹکرایا۔ سر کی چوٹ اور کھنچے جانے کی دہشت نے لڑکی کو ایک دم وحشت زدہ کر دیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی، لیکن اس کی چیخ حلق میں گھٹ گئی۔ اسے جب تک بات سمجھ میں آتی تب تک دکان کا شٹر پھر سے گر چکا تھا اور وہ ایک ایسی چارپائی پر پٹخ دی گئی تھی جو بری طرح جھینگا ہو چکی تھی اور جس پر آٹے کی پرت در پرت جمی ہوئی تھی۔

"میں تمہاری بہن ہوں بھیا، مجھے گھر جانے دو!"

یہی اکیلا جملہ تھا جو وہ لڑکی بول پائی۔ اس پر تینوں دھیرے دھیرے ہنسنے لگے، ان میں سے ایک نے بوری کاٹنے کے لیے رکھا ہوا چھرے کی شکل کا لوہا اٹھا لیا اور لڑکی کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"چپ سالی، ہم بہن...... ہیں!"

لڑکی چپ ہو گئی۔ اس کے بعد جس تجربے سے وہ ہو کر گزری وہ نہایت لجلجا اور خوفناک تھا۔ جتنی دیر وہ ہوش میں رہی اسے ایسا لگتا رہا جیسے گرم سلاخیں اس کے بدن

میں چبھوئی جارہی ہوں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے مرد کو دیکھتی رہی اور اپنے تجربوں کی دنیا میں کچھ ایسے تجربے جوڑتی رہی جو باقی زندگی میں اس کے ساتھ برے خوابوں کی طرح رہنے والے تھے۔

جس طرح ذبح کیے ہوئے جانور کے منہ سے غوں غوں کی آواز نکلتی ہے، کچھ کچھ اسی طرح کی آواز لڑکی کے منہ سے نکل رہی تھی۔ درد کی لہر تھی جو پاؤں سے اٹھ کر اس کے پورے بدن کو جھنجھوڑتی چلی جارہی تھی۔ وہ بری طرح چھٹپٹا رہی تھی اور کئی بار اٹھنے کی کوشش میں چارپائی کی پٹیوں سے ٹکرا کر زخمی ہوچکی تھی۔ اس کی تکلیف تبھی ختم ہوئی، جب وہ بے ہوش ہوگئی۔

قارئین! اس کے بعد کی تفصیل بے کار ہے۔ جس طرح لڑکی کی ذات یا مذہب کے بارے میں پوچھنا بے کار ہے، اسی طرح اس کی عصمت دری کرنے والوں کی ذات یا مذہب جاننے کا بھی کوئی مطلب نہیں۔ اس بات کی بھی تفصیل جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ آٹے کی دھول اور غبار میں اٹی ہوئی لڑکی ہوش میں آنے کے بعد اپنے پھٹے نچے کپڑوں میں گھر کیسے پہنچی یا پھر اس محلے میں سبھی نامرد بسے تھے، جنہوں نے اپنے دروازوں کھڑکیوں کی درازوں سے لڑکی کو تین درندوں کے ہاتھوں چکی کے اندر کھنچے جاتے دیکھا اور درازیں چپ چاپ بند کرلیں۔ مطلب صرف اس بات کا ہے کہ کرفیو کسی بھی قوم یا مذہب کی لڑکی کو زندگی کے سب سے معصوم تجربے سے بے دخل کرسکتا ہے اور اسے جانوروں کی سطح پر اتار کر احساس کی ایسی خوفناک سرنگ میں ڈھکیل سکتا ہے، جہاں سے ایک بار گزرنے کے بعد پوری زندگی دکھ بھرے خوابوں کی بھول بھلیوں میں تبدیل ہوجائے۔

6

دنیا میں سب سے بڑی ٹریجڈی ماں کی گود میں اس کے بچے کا مرنا ہے۔ یہ ٹریجڈی اس چھوٹے سے دوزخ نما، ڈیڑھ کمرے کے گھر میں چند گھنٹے پہلے واقع ہوئی۔ اس گھر کے مزدور افراد کے لیے موت ایک دیکھی بھالی صورت حال تھی، ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی بچہ اس گھر میں یا پڑوس میں مرتا تھا۔ بھوک، غریبی اور جہالت سے جو ماحول یہاں بنتا تھا اس میں بچوں کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ تھا۔ لہٰذا بڑے لوگوں کے لیے تو اس میں بہت کچھ غیر یقینی نہیں تھا، لیکن گھر میں موجود بچے اور سعیدہ اس حادثے سے بری طرح ہل گئے تھے۔

کمرے کے بیچوں بیچ دو ڈھائی فٹ لمبی ایک لاش پڑی تھی جسے ایک سفید چادر کے پھٹے ٹکڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ گھر کے سارے بڑے افراد کمرے کے چاروں طرف دیواروں پر سر ٹکائے ادھ لیٹے پڑے تھے۔ سعیدہ کی بڑی بچی جو ابھی ساڑھے تین سال کی ہوئی تھی، ایک ٹک اپنی بہن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہوش میں آج پہلی بار اس کی بہن خاموش پڑی تھی، نہیں تو جب بھی اس نے دیکھا اسے منمناتے یا روتے ہی دیکھا تھا۔ ایک بار اس نے پوچھا بھی:

”کس امی، آج بہنا بولت کاہے نہیں؟“

مگر اس پر سعیدہ اتنی زور سے دہاڑ مار کر روئی کہ وہ گھبرا کر چپ ہوگئی۔ اسے لگا کہ اس نے کوئی ایسی بات پوچھ لی ہے جو اسے نہیں پوچھنی چاہیے تھی۔ اس کا سات سال کا پھپھیرا بھائی دوسرا ایسا فرد تھا جو اس موت سے بری طرح بے چین تھا۔ دراصل چھوٹی

لڑکی ان دونوں بچوں کے لیے کھلونے کی طرح تھی۔ اس کے آنے کے بعد یہ دونوں اپنے کو بڑا سمجھنے لگے تھے۔ سعیدہ اکثر کام دھندے میں پھنسی رہنے پر چھوٹی بیٹی کو ان دونوں کے حوالے کر دیتی تھی۔ حالانکہ دونوں کو چھوٹی کا لگاتار رونا یا منمنانا پسند تھا، پھر بھی دونوں اس کے ساتھ بڑوں کی طرح پیش آتے۔ اسے تھالی یا کٹوری بجا کر چپ کرانے کی کوشش کرتے یا اپنی گود میں لٹا کر بڑوں کی طرح پانی یا دودھ چمچ یا کٹوری سے پلانے کی کوشش کرتے۔

بچی کی موت دن چھپنے سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے رات اتر آئی اور اس نے اس گھر کو بھی باہر کے پورے ماحول کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس گھر میں دو بلب تھے، ایک اس کمرے میں جہاں گھر کے افراد بیٹھ کر بیڑی بناتے تھے اور دوسرا پیچھے برآمدے میں جس کی روشنی میں اس برآمدے میں ایک کنارے بنی رسوئی اور سنڈاس تک جاتی تھی۔ دونوں کی مریل روشنی نے گھر کے افراد کو جادو لوک کی مصور پر چھائیوں سا بنا دیا تھا۔

غم اور ماتم کی رات اتنے دھیرے دھیرے گزرتی ہے کہ لگتا ہے وقت تھم گیا ہے، ایسی رات، کسی بھی طرح کٹتی دکھائی نہیں دیتی۔

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے
کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
یہ کیسی شب ہجر ہے یا الٰہی!
نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

اس گھر کے افراد کے لیے بھی آج کی رات کچھ ایسی ہی ہوگئی ہے۔ گھر کے دو چھوٹے فرد موت کے اسرار سے جوجھتے جوجھتے زمین پر لڑھک گئے۔ دوپہر بعد سے ان کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔ بھوک نے کافی دیر تک انہیں سونے نہیں دیا، لیکن نیند تو بچوں کی سب سے پیاری دنیا ہوتی ہے، لہٰذا خالی پیٹ بھی وہ دھیرے دھیرے نیند کے سمندر میں کھو گئے۔ جانے یہ گھر کی عورتوں کو ماتم کرتے ہوئے دیکھنے کا اثر تھا یا بھوک سے انتڑیوں کی اینٹھن کا نتیجہ، ان کی ننھی آنکھوں سے کافی آنسو بہے تھے اور

دونوں کے گالوں پر آنسو لکیروں کی شکل میں جم گئے تھے۔

گھر کے بڑے افراد دیوار پر سر ٹکائے بیٹھے تھے۔ سعیدہ کا بوڑھا سر اپنی آنکھیں آدھی کھولے، کمرے کی نہ جانے کس چیز پر انہیں ٹکائے، خاموش، دھیان میں گم سا بیٹھا تھا۔ اپنے بچپن میں ماں باپ کی موت کو چھوڑ کر آج تک کسی کی بھی موت پر وہ مضطرب نہیں ہوا تھا۔ باپ سے وہ بہت زیادہ لگاؤ محسوس کرتا تھا اور اس کی موت کے وقت تک وہ اتنا سمجھ دار ہو گیا تھا کہ موت کا مطلب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ اس کا باپ اسے بہت پیار کرتا تھا اور دن بھر بیڑی بنانے کے بعد اسے شام کو گھمانے ضرور لے جاتا تھا۔ اسے سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے یہ سکھ حاصل تھا، گھوم کر جب وہ لوٹتا تو اس کے پاس رنگ برنگے کنچے اور پتنگیں ہوتی تھیں اور اس کے منہ اور مٹھیوں میں کھٹی میٹھی گولیاں بھری ہوتیں۔ اس کے سارے بھائی چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے بیڑیاں بناتے رہتے اور وہ ان کے حسد کا مرکز بنا، بیچ کمرے میں بیٹھ کر پتنگ میں ڈور چڑھاتا یا کنچے کھیلتا۔ باپ کے مرنے کے بعد اسے جو احساس ہوا وہ بعد کی موتوں پر نہیں ہوا۔ بعد کے برسوں میں موت اس کے لیے معمولی اور ٹھنڈی شے بن گئی، جس علاقے میں وہ رہتا تھا وہاں پچیس سال کے بعد ہر شخص تمباکو اور سیلن کا شکار ہو کر ٹی بی کا مریض بن جاتا تھا۔ بچے بھی بہت زیادہ تعداد میں پیدا ہوتے اور اسی شرح میں مرتے تھے۔ دراصل موت اس کے لیے اتنی جانی پہچانی شے تھی کہ آج بچی کی موت نے اس پر زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اسے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ بچی کو دفن کیسے کیا جائے گا۔ آج رات کرفیو کھلنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کل دن میں بھی کرفیو کھلے گا یا نہیں، کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ صبح صبح اس کا لڑکا بالٹی لیے جس طرح پانی چھلکاتا ہوا گھر کے اندر آیا اور گھر کا دروازہ بند کر کے ہوا کو گالیاں دیتا رہا، اس سے وہ صاف سمجھ گیا تھا کہ باہر اسے ذلیل کر کے کھدیڑا گیا ہے۔ جس طرح کی سڑی گرمی پڑ رہی تھی، اس میں لاش دوپہر شروع ہونے سے پہلے ہی دفن ہو جانی چاہیے تھی، نہیں تو اس میں سڑاند اور بدبو شروع ہو جاتی۔

کرفیو کا اسے پرانا تجربہ تھا۔ کرفیو کے دوران کوتوالی میں بیٹھ کر ایک مجسٹریٹ کرفیو

پاس بنا تا تھا۔ یہ پاس بنوانا اس جیسی حیثیت کے لوگوں کے لیے آسان نہیں تھا۔ پچھلے ایک آدھ موقع پر اس نے پاس بنوانے کی کوشش کی تھی اور ہر بار ناکام ہو کر لوٹا تھا۔ لڑکے سے کہنے کے لیے اس نے کئی بار ہمت بٹورنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار اس کا منہ دیکھ کر چپ رہ گیا۔

یہ لڑکا اس کی اولاد میں دوسرے نمبر پر تھا، لیکن لڑکوں میں پہلے نمبر کا ہونے کے سبب وہ ذمے داری کے احساس سے وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کے اندرون بڑا ہونے کا یہ احساس اتنا گہرا بیٹھا تھا کہ تیرہ چودہ سال کا ہوتے ہوتے وہ بیڑی بنانے کی مشین میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ نہ اس نے دوسرے لڑکوں کی طرح کیرم بورڈ اور شطرنج کھیلنے کے لیے باہر گلی کے چبوتروں پر بھاگنے کی کوشش کی اور نہ ہی پتنگ اڑانے کے لیے دریا کے کنارے دوڑ لگائی۔ اس کے اس غیر معمولی ذمے داری کے احساس نے اس کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک ایسی پرت چڑھا رکھی تھی جسے چھید کر اس کے من میں کچھ تھاہ لگا پانا نہایت مشکل تھا۔ گھر کا کوئی فرد اس سے ایسی بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا جس کے بارے میں توقع ہوتی کہ وہ اسے پسند نہیں آئے گی۔ آج وہ سب سے چھپ کر پیچھے برآمدے میں رو آیا تھا۔ یہ بات بھی گھر کے دوسرے افراد کے لیے تعجب کی تھی، جس لڑکی کو اس نے کبھی گود میں اٹھا کر پیار تک نہیں کیا اس کے لیے وہ رونے لگا، یہ کسی کو امید نہیں تھی۔ بہر حال رونے سے اس کے چہرے کی سختی غائب ہو گئی۔ اس کا چہرہ صاف شفاف نیلے پانی کی طرح ہو گیا تھا جس پر کھنچی دکھ کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ شاید اس کے چہرے کی یہ نرمی تھی، جس سے متاثر ہو کر اس کے باپ نے اس سے کہہ ہی دیا:

''پاس بنوائے جائے کے ہے۔''

''کے جائے؟''

''تو اور کے؟''

''ہم نہ جاب۔''

''کاہے؟''

پھر وہ خاموشی جس سے سب سراسیمہ ہو جائیں، مگر اس بار اس خاموشی کی دہشت کو سعیدہ نے توڑا۔ عام طور سے وہ ساس سسر کے سامنے نہیں بولتی تھی۔ ساس سسر کے سامنے شوہر سے بولنے کی بات تو اور بھی خیالی تھی، لیکن دکھ نے اسے دنیا داری سے پرے کر دیا۔ وہ ابھی تک اسی سوچ سے نہیں ابھری تھی کہ اگر اس کے خاندان کے کسی مرد نے ہمت دکھائی ہوتی اور کرفیو میں جا کر دوا لے آیا ہوتا تو شاید اس کی بٹیا بچ گئی ہوتی۔ اب اس کے شوہر کی بزدلی کے سبب بیٹی کی مٹی بھی خراب ہوگی۔ دکھ یا غصے میں اکثر وہ کھڑی بولی بولنے لگتی تھی، آج تو دونوں کی کیفیت تھی۔ اس نے اونچی آواز میں آہ وزاری شروع کر دی۔ ''ہے مولا، میری بٹیا کو زندہ رہتے دوا نہیں ملی اور اب مرے کے بعد قبر و نہ نصیب ہوگا کا... ہے مولا، کا ہے اس ابھاگن بٹیا کو اس گھر ما بھیجے...''

سعیدہ کے رونے نے سب سے پہلے اس کے سسر کو توڑا۔ بوڑھا مذہبی آدمی تھا، دونوں وقت کی روٹی کمانے سے فرصت پاتا تو روزہ نماز میں لگ جاتا۔ یہ تصور بھی اس کے لیے محال ہو گیا کہ اس کی پوتی کو مذہبی طریقے سے مٹی نہیں ملے گی۔ اس نے گھر والوں کے چہروں پر نظر ڈالی، سبھی تھکے، پست چہرے زمین پر نظریں گڑائے بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چرا کر وہ سعیدہ کے رونے کا مقابلہ کر رہے تھے۔

''کون سکھ ملا رہے مورسون چریا کو اِی گھر میں آ کے... نہ ڈھنگ سے دودھ ملا، نہ دوا نہ دارو! اب قبر و نہ ملی... کا مورے آکا!''

بوڑھے کو شدید بے چینی ہونے لگی۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اسے امید تھی کہ اس کی بیوی تو اسے قوت مدافعت دے گی ہی، لیکن اس کی بڑھیا بھی اس سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ ایک آدھ بار دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں، لیکن ہر بار بڑھیا زمین پر یا خلا میں تاکنے لگی۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی، سات سے کچھ اوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ اس سال پتا نہیں کیا انتظام تھا، لیکن پچھلے کرفیو کے موقعوں کا اسے تجربہ تھا۔ ساڑھے سات بجے کے بعد کوئی کرفیو پاس بنانے والا آفسر آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ اگر پاس بنوانا تھا تو فوراً گھر سے نکلنا تھا۔ وہ کمزور ارادے کے ساتھ تقریباً لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا۔ لگاتار بیٹھے رہنے سے اس کا ایک پیر سن ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے مالش کر کے اور چٹکی

کاٹ کر اس پیر کو جگایا، کیل پر سے اتار کر کرتا اپنے بدن پر ڈالا۔ آہستہ آہستہ ایک بیڑی سلگائی اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

گھر سے باہر گلی میں گھنا اندھیرا شانت جھیل کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ پہلا پیر رکھتے ہی وہ پوری طرح اس میں ڈوبتا چلا گیا۔ زندگی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ روز اس وقت یہی گلی آوازوں سے گونجتی رہتی تھی۔ اس وقت بالکل سناٹا تھا، اس وقت بچھنے والی چارپائیوں کی قطاریں غائب تھیں اور روز جس گلی میں آدھی رات تک کسی سے ٹکرائے بغیر نکلنا دوبھر تھا وہ آج کسی چوڑی سڑک کی طرح لگ رہی تھی۔

اس گلی میں عام روشنی پہلے بھی برائے نام تھی اور آج تو گھروں کے کواڑ بند ہونے کی وجہ سے ان سے گلی میں پڑنے والی روشنی اور بھی چھن چھن کر پڑ رہی تھی۔ ایک طرح سے اندھیرے ہی میں وہ آگے بڑھا، مگر اس کا اسے خوب اندازہ تھا۔ بچپن سے وہ انہیں گلیوں میں پلا بڑھا تھا۔ مکان ضرور اس نے دو تین بدلے تھے، لیکن سب اسی علاقے میں تھے۔ گلیاں اندر اندر میلوں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی اجنبی اگر ان میں پھنس جائے تو اسے باہر کی بڑی سڑک پر نکلنے ہی میں گھنٹوں لگ جائیں، لیکن بوڑھے کی یہ جانی پہچانی دنیا تھی۔ اس میں وہ اندھیرے میں بھی تیرتا چلا جا سکتا تھا، مگر آج کی بات کچھ اور ہی تھی۔

آج گلیوں میں خوف پیدا کرنے کی حد تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ جہاں دو تین گلیاں ملتیں یا کوئی گلی سڑک پر نکلتی وہیں پولیس کے جوان جتھے بنائے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ سیٹی بجاتے یا کوئی دکھائی دے جاتا تو سڑک پر ڈنڈے پٹک کر اسے گالیاں دیتے ہوئے للکارتے۔ پولیس والوں کے ڈر سے بوڑھے کو کافی لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ اس کے گھر سے کوتوالی مشکل سے ایک کلومیٹر دور تھی، لیکن آج چکر لگاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ یہ فاصلہ نہ جانے کتنا بڑھ گیا ہے۔ پولیس والوں سے بچتا بچاتا وہ کوتوالی کے ایک دم پچھواڑے پہنچ گیا تھا کہ اچانک پکڑا گیا۔

ہوا یہ کہ ایک گلی میں سے نکل کر اسے بڑی سڑک پر آنا تھا، گلی کے اندر سے سڑک کا جو حصہ دکھائی دے رہا تھا وہ بالکل خالی تھا۔ کوئی آواز بھی نہیں تھی، لیکن سڑک پر آ کر جیسے ہی وہ تین چار قدم آگے بڑھا، گالیوں کی بوچھار اس کے کانوں میں پڑی۔ اس کے بوڑھے جسم

نے بھاگنے کی مضحکہ خیز حرکت کی، مگر ایک ڈنڈا اس کے پیروں پر پڑا اور وہ گر پڑا۔ گرنے پر اس نے محسوس کیا کہ غلطی کہاں پر ہوئی۔ گلی جہاں کھلتی تھی وہیں ایک دکان کی بنچ پر کچھ سپاہی ایک کھمبے کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تھکے، اکتائے ہوئے، وہ اونگھ رہے تھے۔ اس لیے خاموش تھے۔ بوڑھے کو دیکھ کر وہ چوکنا ہو گئے اور ان میں سرگرمی آگئی۔

پتا نہیں بڑھاپا تھا یا دہشت، بوڑھا گرا تو پھر دیر تک نہیں اٹھا۔ پسینے اور رال نے اس کی داڑھی بھگو دی اور اس کی مغموم ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں سپاہیوں پر ٹکی اگلے ڈنڈے کا انتظار کر رہی تھیں، لیکن اگلا ڈنڈا نہیں اٹھا۔ اس کے بڑھاپے نے سپاہیوں کو بے بس کر دیا۔ جس سپاہی نے ڈنڈا مارا تھا وہی گالیاں بکتا رہا، باقی سب بوریت سے بھرے بیٹھے رہے۔

''مادر...... اس کرفیو میں نکلنے کو کیا ڈاکٹر بتائے رہے؟''

بوڑھا چپ رہا، کچھ بولنے کو اس کے ہونٹ کانپے، لیکن حلق سے غوں غوں کے سوا کوئی صدا نہیں نکلی۔

''بول سالے، کوئی بم وم تو نہیں چھپائے ہے؟ مسلوں کا کوئی بھروسا نہیں! دیوان جی تلاشی لے لوں کیا؟''

''لے لو۔ لیکن پوچھ تو لو کہاں جا رہا تھا۔''

''بول بے! کہاں جا رہا تھا؟''

بوڑھے نے بولنے کی کوشش کی مگر اب بھی اس کی آواز سمجھ میں آنے لائق نہیں تھی۔ سپاہی نے اس کا کالر پکڑ کر اسے اٹھالیا۔ بوڑھے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ملتجیانہ کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر گھبراہٹ اور ڈر سے نکلی آواز سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

''بہن ...... بولتا ہے یا دوں ایک رپٹا اور؟'' سپاہی نے ہاتھ اٹھایا۔ جڑے ہوئے دونوں ہاتھ بوڑھے نے اپنے منہ کے سامنے کر لیے۔ سپاہی نے بھی مارا نہیں صرف دھمکاتا رہا، تھوڑی دیر میں بوڑھے کے بول صاف پھوٹے:

''سرکار، پاس بنوائے جا رہا، گھر میں مٹی پڑی ہے۔ نا تن گزر گئی۔''

''کیا— ؟'' سپاہی تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔

''جھوٹ تو نہیں بول رہا؟ ابھی گھر چل کر دیکھیں گے، اگر غلط نکلا تو سالے......

ڈنڈا ڈال دیں گے!'' دوسرے سپاہی نے کہا۔

''چلو دیکھ لو صاحب! پاپے ماں گھر ہے۔''

اس پولیس ٹکڑی کا افسر ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ وہ ابھی تک زیادہ نہیں بولا تھا، مگر بات لمبی کھنچتے دیکھ کر اس نے دخل دیا:

''جانے دو بھیا! غمی کسی پر بھی پڑ سکتی ہے۔''

''کتوؤں کو بچے پیدا کرنے کے سوا اور کیا کام ہے! سالے چوہے کے بچوں کی طرح پیدا کریں گے اور مریں گے۔ چھوڑ سالے کو، بھاگ جا بے! بنا پاس لیے لوٹا تو سمجھ لے تیرے باپ یہاں بیٹھے ہیں۔ بھاگ... بھاگ جا!''

بوڑھا بھاگنے کی حالت میں نہیں تھا، لیکن لڑکھڑاتے قدموں سے جس رفتار سے وہ چلا وہ اس کی عمر کے لحاظ سے بھاگنے جیسی ہی تھی، وہ ایک آدھ بار لڑکھڑایا۔ گرتے گرتے سنبھلا اور گرتا سنبھلتا آخر میں کوتوالی کے موڑ پر پہنچ ہی گیا۔

کوتوالی میں پچھلے برسوں جیسا ہی منظر تھا۔ باہر سڑک پر پولیس، پی اے سی اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں پٹی پڑی تھیں۔ پولیس کے جوان بے ترتیب سڑک پر بند پڑی دکانوں کے چبوتروں، بنچوں اور بھٹیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں کسی بڑے افسر کے آنے پر ان میں ہلچل ہوتی، لیکن پھر جلد ہی وہ تھکان اور بوریت کے مہا ساگر میں ڈوب جاتے۔ ایک کنارے پر بیٹھی ایک لیڈی مجسٹریٹ کرفیو پاس بنا رہی تھی۔ اس کا کمرہ اور کمرے کے باہر کا برآمدہ مچھلی بازار کی طرح شور وغل سے بھنبھنا رہا تھا۔ کمرے کے باہر اندر دلالوں، نیتاؤں، صحافیوں، خدائی خدمت گاروں اور مصیبت زدہ لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ پریشان حال لوگ ایک ایک پاس کے لیے گڑگڑا رہے تھے۔ نیتا اور دلال دھڑا دھڑ پاس بٹور کر اپنے چمچوں کو دیتے جا رہے تھے۔ جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا، جھڑکیاں کھاتے ہوئے ایسے لوگوں کی بھیڑ میں بوڑھا بھی شامل ہو گیا۔

بوڑھا اس ملک میں ایسے کثیر لوگوں کے گروہ کا حصہ تھا جس کے لیے عزت اور ذلت کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ بے کسی ان کے وجود کا اٹوٹ حصہ بن جاتی ہے۔ زندگی بھر دھتکارے جاتے، ڈانٹیں کھاتے، ان کا پورا قد انسانی قد سے کافی چھوٹا ہو جاتا ہے۔

بوڑھا بھی بار بار بھیڑ میں ہچکولے کھاتا، لتاڑا جاتا، دائیں بائیں ہوتا رہا اور آخر میں مجسٹریٹ کی میز تک پہنچ ہی گیا۔

''نام؟ نام بولو، جلدی! اب کیا ایک گھنٹے تک میں تم سے نام ہی پوچھتی رہوں گی؟'' مجسٹریٹ کی جھنجھلائی ہوئی آواز نے بوڑھے کو جھنجھوڑا۔

''عبدالرشید... عبدالرشید...''

''وجہ؟''

''جی...''

''جی جی کیا کر رہا ہے؟ پاس لینے کی وجہ کیا ہے؟''

''پوتی مرگئی ہے، کل مٹی دینی ہے۔''

''اوہ... کیا عمر تھی اس کی؟'' آواز پہلی بار نرم ہوئی۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مری ہوئی پوتی کی عمر یاد کرنے کی اسے ذرا بھی خواہش نہیں ہوئی۔

''کتنے لوگ جائیں گے؟''

''سات آٹھ۔''

''سات آٹھ کیوں؟ دو بہت ہیں۔'' آواز پھر چڑچڑاہٹ اور جھنجھلاہٹ سے پیدا ہوگئی۔ بوڑھے نے ایسے موقعوں پر وہی کیا جو اس دنیا کے لوگ کرتے ہیں۔ پہلے اس نے بحث کرنے کی ناکام کوشش کی، پھر ڈانٹ دیے جانے پر وہ ادھورے لفظوں میں گڑگڑانے لگا۔ کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر اس نے مجسٹریٹ کے پیر پکڑنے کی کوشش کی۔ آخر میں جھڑکی کے ساتھ وہ تین لوگوں کے لیے کل صبح کا کرفیو پاس مٹھی میں بھینچے کمرے سے باہر نکل گیا۔

راستے بھر اسے دو تین جگہ ٹوکا گیا۔ دو تین جگہ اسے پولیس والے ہی ملے۔ لیکن کرفیو پاس نے اس کے دل میں ایک خاص طرح کی خوداعتمادی بھر دی تھی، ایک آدھ بار جب پولیس والوں نے کرفیو پاس الٹ پلٹ کر دیکھا، اسے پھاڑ کر پھینکنے کی دھمکی دی یا سچ مچ ہی ہوا میں اچھال کر زمین پر پھینک دیا، تو اس کی خوداعتمادی ڈگمگائی ضرور، لیکن

پھر بھی اس کی بے کسی اور خود اعتمادی نے مل کر ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ دھیرے دھیرے کسی طرح گھر پہنچ ہی گیا۔

گھر تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح تھا۔ اس میں اس کے آنے سے ہلکی ہلکی ہلچل شروع ہوگئی۔ سبھی بڑے لوگ جاگ کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک بار ہلکے سے کھٹکھٹانے ہی پر بڑھیا نے دروازہ کھول دیا۔ ایسا لگا جیسے وہ اس کا دروازے سے لگ کر انتظار کر رہی تھی۔ اسے غصہ بھی آیا کہ بنا نام وام پوچھے بڑھیا نے کیسے دروازہ کھول دیا، لیکن وہ ضبط کر گیا۔

''پاس ملا؟'' بڑھیا نے اس سے گھر میں گھستے ہی پوچھا۔

''ہاں ملا۔ تین جنے جائیں گے، صبح مولوی صاحب کا دیکھے کا پڑی۔''

''بس تین جنے؟ کیسے کل ہوئی؟''

ساس کی آواز سن کر سعیدہ کچھ چونکی۔ وہ گھٹنوں میں منہ دبا کر بیٹھی تھی۔ اسے لگا کہ شاید اس کا سسر ناکام لوٹا ہے۔ اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

''ہے مولا، ہمری بٹیا کے کا ماٹی بھی نہ ملی...''

''چوپ ... سالی ... خوب ملی ماٹی۔ من بھر کے ماٹی دے کل!'' اس کے شوہر نے اسے بیچ ہی میں ڈانٹا۔ پوری واردات میں اپنی بیوی کے سامنے بزدل ثابت ہو جانے کے احساس نے اسے درندگی کی حد تک وحشی بنا دیا تھا۔ وہ اتنا خاموش طبیعت کا انسان تھا کہ اس نے شاید ہی کبھی اپنی بیوی کے ساتھ گالی گلوج کی ہو۔ آج پتا نہیں بیوی کی نظر میں ڈرپوک ثابت ہو جانے کی شرم تھی یا اپنی مرتی ہوئی بیٹی کے لیے کچھ نہ کر پانے کی بے بسی، جس نے اسے وحشی بنا دیا۔ اگر سعیدہ فوراً پوری بات سمجھ کر چپ نہ ہو جاتی تو شاید وہ اسے مار بھی بیٹھتا۔

بوڑھے کے آنے کے بعد خاموش کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے آوازوں کی جو ہلچل ہوئی تھی، وہ جلد ہی دھیرے دھیرے پھر خاموشی میں بدل گئی۔ کمرے کے افراد جنہوں نے کھڑے ہونے یا بیٹھنے کے لیے اپنے پہلو بدلے تھے، پھر سے دیواروں پر پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گئے۔ صرف سعیدہ کی ساس اٹھ کر بکسے الٹ پلٹ رہی تھی۔ کافی محنت

کے بعد اسے ایک سفید چادر مل ہی گئی۔ وقت کی مار نے اسے بدرنگ بنا دیا تھا، مگر سعیدہ کی ساس کو لگا کہ اس کے سوا کفن کے کام آنے کے لیے اس کے پاس کوئی اور کپڑا اس وقت نہیں مل سکتا تھا۔ وہ اسی کپڑے کو لے کر قینچی سے کاٹ چھانٹ کرنے لگی۔

رات کو تو بہر حال بیتنا ہی تھا، لیکن جاگتی آنکھوں سے یہ قرض کی صورت میں ادا ہو رہی تھی۔ بچی کی لاش کے اردگرد چھوٹے بچے فرش پر لڑھک گئے تھے۔ اگر لاش کا منہ کپڑے سے ڈھکا نہ ہوتا تو یہ بھی ان نیند میں ڈوبے بچوں میں سے ایک ہوتی۔ بڑوں کے پیٹ میں صبح کے بعد پانی کے سوا کچھ نہیں گیا تھا۔ پانی بھی کفایت کے ساتھ خرچ ہوا تھا۔ اس لیے سب کی آنتیں بھوک سے اینٹھی ہوئی تھیں اور سبھی کے حلق پیاس سے سوکھے تھے۔ یہ روز کمانے اور روز کھانے والوں کا گھر تھا۔ کرفیو لگنے کے دوسرے یا تیسرے دن سے فاقوں کی نوبت آجاتی تھی۔ اگر موت نہ ہوئی ہوتی تب بھی شاید یہی حالت ہوتی۔ وہ سبھی نیم دراز کل کی فکر میں تھے۔ اگر کل بھی کرفیو نہیں ہٹا تو دوسرے وقت تک تو گھر کے بچوں کو بھی فاقہ کرنے کی نوبت آجانے والی تھی۔

ٹمٹماتے بلب کی روشنی میں رات بیتی۔ لیکن بہت دھیمے دھیمے۔ باہر گلی میں دو ایک بار پولیس والوں کے بوٹوں کی آہٹ گونجی۔ ایک آدھ بار دور کہیں ہر ہر مہادیو یا اللہ اکبر جیسی آواز سنائی دی۔ کمرے کے لوگ ایک دوسرے سے آنکھیں چرائے، بہت آہستہ آہستہ حرکت کرتے رہے اور رات دھیرے دھیرے بیتتی رہی۔

7

سڑی گرمی کی دوپہر میں تین بجے بجلی چلی گئی اور جلد ہی سفید پوشوں کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ ایک کمرے میں ایک خاتون مجسٹریٹ بیٹھ کر پاس بنا رہی تھی، اس کے کمرے میں اتنی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر پلے ہوئے تھے اور ایک کے اوپر ایک گرے پڑ رہے تھے۔ ایسے میں بجلی چلی گئی اور پنکھا بند ہوا تو پسینے اور جھنجھلاہٹ نے کمرے کو چھوٹے موٹے لڑائی کے میدان میں تبدیل کر دیا۔

پنکھا بند ہوتے ہی بغل کے بڑے کمرے میں بیٹھے صحافیوں نے فساد کا تذکرہ چھوڑ کر بجلی کے محکمے کو کوسنا شروع کر دیا۔ انہیں تین بجے ضلع کے اعلیٰ حکام نے بریفنگ کے لیے بلایا تھا۔ ایک تو ساڑھے تین بج چکے تھے اور اعلیٰ حکام ابھی تک غیر حاضر تھے، دوسرے بجلی چلی گئی۔ صحافیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ جو چھوٹے افسران ابھی تک بیٹھے انہیں بہلا رہے تھے، دھیرے دھیرے باہر کھسک گئے۔ صحافیوں نے پریس کانفرنس کے بائیکاٹ کی بات کی اور بنا کسی بے صبری کے بیٹھے رہے۔ آج ان کا اپنا مطلب تھا اس لیے چاہے جتنی بھی دیر ہو وہ اٹھنے والے نہیں تھے۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو ان میں زیادہ تر پیر پٹختے ہوئے نکل جاتے اور چھوٹے افسران ان کے سامنے گھگیاتے رہ جاتے۔

تیسری طرف کوتوالی کے آنگن میں ایسے لوگوں کی بھیڑ تھی جنہیں امن کمیٹی کی میٹنگ کے لیے بلایا گیا تھا۔ یہ سیاست داں، سوشل ورکر، بیوپاری اور ڈاکٹر وکیل جیسے پیشوں سے وابستہ لوگ تھے جو ہر سال فساد کے موقعے پر یا تہوار وغیرہ کے دنوں میں

کوتوالی میں بلائے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے چہرے اور تقریریں اتنی گھس پٹ گئی تھیں کہ کوتوالی کی دیواریں بول سکتیں تو ان کے کھڑے ہوتے ہی ان کی تقریر دہرانے لگتیں۔ اس سال بھی فساد شروع ہونے پر پہلے تو افسروں نے حکم جاری کیا کہ ایک پرندہ بھی سڑکوں پر نہ دکھائی دے اور باہر نکلنے والوں کی کھال کھینچ لی جائے۔ بعد میں جب منتریوں کے دورے شروع ہوئے اور یہ شکایت کی جانے لگی کہ عوامی نمائندوں کا اشتراک نہیں لیا جارہا ہے، تب انہوں نے رات دیر گئے امن کمیٹی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ صبح سے دوپہر تک جلدی جلدی لوگوں کو اطلاع دینے کے لیے سپاہی دوڑائے گئے اور تین بجے کے اجلاس کے لیے ساڑھے تین بجے تک دس پندرہ لوگ اکٹھے ہوگئے۔ اکادکا لوگ ابھی تک آتے جارہے تھے اور آنے کے بعد قریب قریب سبھی لوگ یہی قصہ سناتے کہ کس طرح انہیں دیر سے خبر ملی اور کس طرح انہوں نے فوراً بدن پر کرتا ڈالا یا چپلیں پہنیں اور بھاگے چلے آئے۔ اس طرح کا اجلاس کبھی وقت پر نہیں شروع ہوا تھا۔ اس لیے امید تھی کہ اگلے ایک آدھ گھنٹے تک لوگ آتے رہیں گے۔ حکام نے سوچا بھی یہی تھا کہ پریس کانفرنس کے بعد یہ اجلاس شروع ہوجائے۔

بجلی کے جاتے ہی تینوں جتھوں میں بٹے ہوئے لوگ ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہونے لگے۔ اُمس اور پسینے سے تر لوگوں کے لیے بیٹھنا مشکل ہونے لگا۔ پریس کے لوگ اٹھے اور باہر برآمدے میں دو تین گروپوں میں بٹ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کی بات چیت کا خاص موضوع فساد کی شروعات کی وجہ اور فساد میں افسروں کی ناکامی تھا۔

منشی ہر پرشاد پرانے جنگ آزادی کے سپاہی تھے اور پچھلے بیس برسوں سے راجدھانی سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے کے نمائندہ خصوصی تھے۔ وہ ستر سال کی عمر میں بھی بالکل چاق و چوبند رہتے تھے۔ لوگ انہیں چھیڑتے تھے اور وہ ہر بار کوئی ایسا بے باک تلخ تبصرہ کردیتے تھے جس سے کوئی نہ کوئی تلملا جاتا اور دوسرے لوگوں کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہوجاتا۔ آج وہ خاموش بیٹھے تھے اور کئی صحافیوں کی کوششوں کے باوجود کچھ نہیں بولے۔

''کیا بات ہے منشی جی! آج طبیعت کچھ ڈھیلی لگ رہی ہے۔''

''طبیعت سسری کو کیا ہوا ہے، لیکن ...'' منشی جی نے بہت ٹالنے کی کوشش کی، لیکن پھر انہیں محسوس ہوا کہ نہ بولنے پر چھیڑ خانی ہوگی، اس لیے بولے۔ ''میں سوچ رہا تھا یہ امن کمیٹی کے نام پر جو شنکر جی کی برات کوتوالی میں اکٹھی کی گئی ہے، اگر ان سب کو بند کر دیا جائے تو شہر میں دنگا فساد ابھی رک جائے۔'' تیز ہنسی کا فوارہ چھوٹا، امن کمیٹی میں حصہ لینے والے جو برآمدے میں کھڑے تھے، ان میں سے کچھ نے نہ سننے کا ناٹک کیا اور کچھ تلملا گئے۔ کچھ جو زیادہ موٹی چمڑی کے تھے، انہوں نے ہنسی میں ساتھ دیا۔

''انہیں کو کاہے کو بند کرتے ہیں منشی جی! ارے اپنے صحافی ساتھیوں کی بات کیجئے نا، جو چٹخارے لے لے کر خبریں چھاپ رہے ہیں۔ مرے گا ایک، انہیں لاشیں پچیس دکھائی دیں گی۔ پٹاخا چھوٹے گا تو بم چھاپیں گے۔ ہمارے ساتھ ساتھ انہیں بھی بند کیجئے تبھی فساد رکے گا۔''

اس کے بعد تھوڑی دیر ہنگامہ ہوتا رہا۔ پریس کی آزادی سے لے کر انتظامیہ میں عوام کی حصے داری تک تمام باتیں ہوتی رہیں، لیکن جلد ہی معاملہ ٹھنڈا ہوگیا اور دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے ذاتی ہنسی مذاق کرنے لگے۔ زیادہ تر لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنے کے عادی تھے۔

منشی جی پھر افسردہ ہوگئے۔ وہ فساد زدہ علاقوں میں آج دیر تک گھومتے رہے تھے اور تباہی کے ننگے ناچ سے بری طرح بے چین تھے۔ صحافیوں اور امن کمیٹی کے لوگوں کے درمیان جو فحش قسم کے مذاق چل رہے تھے، انہوں نے انہیں اور غم زدہ کر دیا۔ راجدھانی سے چار اخبار نویسوں کی ایک ٹیم آئی تھی جو اپنی پوشاک اور کیمروں کی وجہ سے الگ پہچانی جا رہی تھی۔ خود کو مقامی صحافیوں سے زیادہ معزز مانتے ہوئے یہ گروہ الگ کھڑی تھی۔ منشی جی بجھے دل سے اس گروہ کے پاس چلے گئے۔

''منشی جی اِٹ اِز ہاریبل! اتنی بڑی ٹریجڈی اس شہر میں رونما ہو چکی ہے، پھر بھی ان جرنلسٹوں کے احساس خودداری کو کیا ہوگیا ہے؟ کیسے بے شرم ہو کر ہنس رہے ہیں۔''

منشی ہر پرشاد نے آنکھیں سکیڑ کر جینز میں ملبوس لڑکی کو بولتے ہوئے سنا۔ انہیں لگا کہ انہیں قے ہو جائے گی۔ آج یہ لڑکے لڑکیاں ان کے ساتھ گھوم رہے تھے، جلے

ہوئے مکان یا ان کے ملبے میں دبے کنکالوں کو دیکھ کر انگریزی میں اپنی تکلیف بیان کرنے والے ان لوگوں نے تیز دھوپ ہوجانے پر انفارمیشن افسر کی جیپ سے کریٹ اتروا کر ایک ادھ جلے مکان کے برآمدے میں بیٹھ کر ٹھنڈی بیئر پی تھی۔ منشی جی ڈرائیور کی بغل میں بیٹھے غصے سے ہارن بجاتے رہے تھے۔ اب اس لڑکی کو دوسرے بے شرم اور بے حس نظر آرہے تھے۔

کامریڈ سورج بھان منشی جی کی دلی کیفیت بھانپ گئے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے ان کے دوست تھے۔ یہ بات انہیں اچھی طرح معلوم تھی کہ منشی ہر پرشاد صرف قلم گھسیٹ صحافی نہیں تھے۔ خبریں انہیں متاثر کرتی تھیں اور اکثر خبریں جمع کرتے کرتے وہ ان کا حصہ بن جاتے تھے۔ انہوں نے قریب جا کر ملائمت سے منشی جی کا ہاتھ پکڑا اور انہیں ایک دوسرے کونے کی طرف لے گئے۔

برآمدے کے ایک طرف زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے پر لوگوں کا دھیان ادھر منتقل ہوگیا۔ کھیم چند جگل کشور نامی فرم کے مالک لالہ رادھے لال چڑائے جانے پر کسی زخمی ناگ کی طرح پھنکار رہے تھے۔

''ٹھیک ہے فساد میں اناج کی قیمتیں بڑھیں گی تو میرا فائدہ ہوجائے گا، لیکن فائدہ کسے کاٹتا ہے؟ میں اتنا گنہگار نہیں ہوں کہ اپنی بِکری بڑھانے کے لئے خود فساد کرادوں۔ آپ تو شرما جی یہ بھی کراسکتے ہیں۔ آپ کو پاکستان اور مسلم لیگ کے جھنڈے میں فرق نہیں معلوم ہے؟ خلد آباد کی مسجد کے بغل میں مسلم لیگ کا دفتر ہے۔ پھر بھی آپ نے مسلم لیگ کے دفتر پر لہرانے والے جھنڈے کی تصویر چھاپ کر یہ کیپشن دیا کہ مسجد پر پاکستانی جھنڈا لہرایا گیا ہے۔ اب بتایئے، فساد آپ کرارہے ہیں کہ ہم؟''

''لیکن گرو! فساد شروع ہونے پر منافع تو تم ہی کماؤ گے۔''

''ہاں، اب جنتا سالی گدھی ہے، دنگا کرتی ہے، تو چار پیسے ہم بھی کما لیتے ہیں۔''

لوگ ہنسے اور پھر ذاتی قسم کے مذاق ہونے لگے جس سے فضا کا بوجھل پن گھٹنے لگا۔

اس دونوں طرح کی بھیڑ سے الگ تیسری قسم کی بھیڑ تھی جو بجلی چلی جانے کے باوجود کمرے سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہ کرفیو پاس بنوانے والوں کی بھیڑ تھی جو ایک

چھوٹے سے کمرے میں ایک خاتون مجسٹریٹ اور دو تین اہل کاروں سے الجھی ہوئی تھی۔ مجسٹریٹ ایک نوجوان لڑکی تھی جو ابھی نئی نئی نوکری میں آئی تھی۔ نئی ہونے کی وجہ سے ابھی وہ اپنے دوسرے ہم پیشہ افسروں کی طرح بے حس نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کے دل میں کچھ آدرش واد باقی تھا۔ وہ کچھ کام کرنا چاہتی تھی اور جنتا اس کے لیے پوری طرح سے فضول چیز نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے پسینے سے بالکل لت پت ہونے پر بھی وہ اپنے کام میں جٹی ہوئی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ جھنجھلا ضرور جاتی، لیکن اس کی انگلیاں رک نہیں رہی تھیں۔ اس کے عملے نے دو ایک بار گرمی یا اُمس کی دہائی دی لیکن مجسٹریٹ کی بے رخی کی وجہ سے انہیں باہر جانے کا موقع نہیں ملا۔

امن کمیٹی کی میٹنگ میں آئے ہوئے لوگوں میں کچھ سیاسی لیڈر تھے۔ میونسپلٹی کے چناؤ قریب تھے۔ باہر آنے پر انہیں پاس بنوانے والوں میں اپنے ووٹر نظر آ گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے ووٹروں کو پکڑا اور ان کے پاس بنوانے کے لیے چل پڑے۔ ان کے آ جانے سے سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ مجسٹریٹ کی آواز زیادہ جھنجھلانے لگی، ایک دوسرے کو ڈھکیلتے اور شور مچاتے لیڈروں کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ کمرے میں اُمس زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس نے اچانک اپنی فائلیں بند کیں اور اعلان کیا کہ بجلی آنے پر کام ہوگا۔ اس کے ماتحتوں کو موقع ملا وہ سرپٹ کمرے سے نکل بھاگے۔

مجسٹریٹ کے عورت ہونے کے خیال سے لیڈر لوگ پہلے تو سٹپٹا گئے، پھر ایک دم سے شور وغل شروع ہو گیا۔

''افسر شاہی نے دیش برباد کر دیا صاحب! پہلے دنگا کراتے ہیں، پھر جنتا کے ساتھ جانوروں کی طرح پیش آتے ہیں۔''

''اجی دنگا ہو تو ان کی انکم تو اور بڑھ جاتی ہے۔ بانٹیے ریلیف، کمائیے پیسا! ہمیں نہیں پتا یہ کل سے جو دودھ بٹ رہا ہے اس کی ملائی کہاں جا رہی ہے!''

''ارے یہاں دیجیے سو روپیا ایک پاس کا۔ سب بن جائے گا۔ بجلی رہے نہ رہے!''

''کیا... کیا کہا؟ میں پیسا مانگ رہی ہوں؟'' مجسٹریٹ کا چہرہ تمتما گیا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز رندھ گئی، اس کے چپراسی اور ماتحتوں نے دو ایک پولیس

سپاہی بلا لیے اور ان کی مدد سے اسے بغل والے کمرے میں لے گئے۔
مجسٹریٹ نئی تھی اور اس لیے اس طرح کی کیفیت جھیلنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیڈر پرانے تھے، انہیں پتا تھا کہ بھیڑ بن کر کس طرح افسروں کو ہوٹ کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں پریشان اور دکھی لوگوں کا گروہ تھا جنہیں پتا نہیں چل پا رہا تھا کہ انہیں کرفیو پاس کب ملے گا۔ ان میں سے کسی کا بچہ بیمار تھا، کسی کو اسٹیشن جانا تھا۔ یہ لوگ کمرے میں ادھر ادھر پھیل کر بیٹھ گئے۔ انتظار کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔
''ایکسکیوز می...... منشی جی! یہ جھنڈے کا کیا معاملہ ہے؟'' دلی سے آئے ہوئے پریس کے لڑکے لڑکیوں نے منشی جی کو گھیر لیا۔
''جھنڈا؟ کیسا جھنڈا؟'' منشی جی نے ٹالنے کی کوشش کی۔
''ابھی کوئی کہہ رہا تھا کہ یہاں لوکل پریس نے مسلم لیگ کے جھنڈے کو پاکستانی جھنڈا بنا کر چھاپ دیا تھا؟''
منشی جی مقامی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، اس لیے جواب کامریڈ سورج بھان نے دیا:
''بھائی معاف کیجیے گا آپ کا نام نہیں معلوم، لیکن آپ جو بھی ہوں اتنا سن لیجیے کہ آپ کے راجدھانی کے اخباروں نے بھی کم غدر نہیں ڈھایا ہے۔ ہر دنگے میں آپ لوگ پاکستانی ہاتھ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے کوئی دنگا ایسا نہیں ہوا جس میں مسلمان زیادہ نہ مارے گئے ہوں، لیکن آپ لوگ ہمیشہ ایسی خبریں چھاپتے ہیں جن سے لگتا ہے کہ ہندوؤں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ اگر مسلمان پی اے سی کی زیادتی کی شکایت کرتے ہیں تو وہ آپ کو غدار نظر آنے لگتے ہیں۔ لوکل پریس والے آپ کے چھوٹے بھائی ہیں، مسجد کے بغل میں مسلم لیگ کے دفتر پر اس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ تھوڑی سی ٹرک فوٹوگرافی سے جھنڈا مسجد پر پہنچ گیا۔ نیچے یہ کیپشن دینے میں ان کا کیا جاتا ہے کہ جھنڈا پاکستانی ہے۔ اب اس بات سے اگر شہر کا تناؤ کچھ بڑھ گیا تو اخبار والوں کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ دہلی سے لکھنؤ تک اخباروں کے دفتروں میں زیادہ تر پینٹ کے نیچے ہاف پینٹ پہننے والے لوگ ہیں۔''

منشی ہر پرشاد نے کامریڈ سورج بھان کا ہاتھ دبایا اور انہیں ایک کونے میں لے گئے۔ راجدھانی والے ان کے حملے سے کچھ بوکھلا گئے۔ وہ جواب دینا چاہتے تھے، لیکن کامریڈ کے ہٹ جانے سے تلملا کر رہ گئے۔

بجلی اور اعلیٰ حکام ایک ساتھ آئے۔ ایک کمرے میں پریس کانفرنس شروع ہوئی۔

''مرنے والوں کا ٹوٹل کتنا پہنچا؟''

''سترہ—''

''نہر میں کتنے بہا دیے گئے؟''

''..............................''

''مرنے والوں کی گنتی کیسے کرتے ہیں؟''

''مردہ خانے میں پوسٹ مارٹم کے لیے جتنی لاشیں پہنچی ہیں...''

''لیکن جو پہنچ ہی نہیں پائیں۔ جنہیں نہر میں بہا دیا گیا...... ان کا...''

ٹھنڈے کی بوتلیں، برفی اور سموسے آگئے۔ بیچ بیچ میں شکوے شکایتیں ہوتی رہیں کہ پریس کو کرفیو پاس دینے میں دیر کی گئی، کرفیو زدہ علاقے کے دورے کے لیے محکمہ اطلاعات کو دھکا مار جیپ مہیا کرائی گئی، اسے بھی دلی پریس لے کر گھومتا رہا، لوکل پریس والے تاپتے رہے، وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ شکایتیں ہوئیں تو سموسے اور منگا لیے گئے۔

''دنگا ونگا تو چلتا رہے گا، پریس کالونی کا کیا ہوا؟ دنگے کی وجہ سے لیٹ تو ہوگیا ہے، لیکن دنگا ختم ہوتے ہی الاٹمنٹ ہوجانا چاہیے۔''

''ہوجائے گا۔ دنگا نہ ہوتا تو اب تک ہوگیا ہوتا۔ زمین تو طے ہوگئی ہے، ایک دم سول لائنز کے بیچ میں ہے۔ بس پلاٹ کٹنا ہے۔ دنگا ختم ہوتے ہی کٹ جائے گا۔''

کچھ صحافیوں نے اب تک پلاٹ کے لیے درخواستیں نہیں دی تھیں۔ انہوں نے شور مچایا کہ انہیں آخری تاریخ کا پتا نہیں چلا۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ پچھلی تاریخ میں درخواست دے دیں، ان میں سے کئی نے کاغذ پھاڑا اور درخواست لکھنے بیٹھ گئے۔

صحافیوں کو حکام نے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کرکے سمجھا دیا کہ کیسی رپورٹنگ کرنی ہے۔

منشی ہر پرشاد اور کامریڈ سورج بھان باہر نکل آئے۔ کامریڈ سورج بھان تو زبردستی پریس کانفرنس میں بیٹھ گئے تھے، انہیں امن کمیٹی کے اجلاس میں بلایا گیا تھا۔ وہ ادھر چلے گئے۔ ساتھ میں منشی ہر پرشاد کو لیتے گئے۔ وہاں ابھی دیر تھی۔ زیادہ تر حصہ لینے والے باہر گھوم رہے تھے۔ کوئی پاس بنوانے لگا تھا تو کوئی پریس کانفرنس والے کمرے میں تاک جھانک کر رہا تھا۔ جب تک حکام لوگ امن کمیٹی کے پنڈال میں نہ آجاتے تب تک یہی ہونا تھا۔

دونوں ایک کونے میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ ان کے ارد گرد اور لوگ بھی آگئے اور پھر بات چیت فساد کی شروعات، مرنے والوں کی تعداد اور نقصانات پر مرکوز ہوگئی۔

''دنگا کسی نے شروع کیا ہو......'' کامریڈ سورج بھان غم زدہ لہجے میں بولے: ''ایک بات اب بڑی صاف دکھائی دینے لگی ہے۔ آزادی کے وقت بھی دنگے ہوتے تھے تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہوا کرتی تھی جو دنگا کرانے والی طاقتوں کے خلاف کھڑے ہوتے تھے۔ اب ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔''

''اجی اب تو پڑوسی بھی پڑوسی کو نہیں بچاتا۔ پہلے کم سے کم پڑوسی کا یہ بھروسا رہتا تھا کہ وہ حملہ نہیں کرے گا، لیکن اب تو یہ بھی نہیں رہا۔''

''رام پال سنگھ پرانے کمیونسٹ ہیں، پچھلے بیس سال سے کارڈ ہولڈر ہیں۔ ان کا لڑکا دنگے میں مارا گیا۔ میں ماتم پرسی کرنے گیا تو دنگ رہ گیا۔ اتنا بڑا آدمی فرقہ پرست ہوگیا۔ کھلے عام مسلمانوں کے خلاف بول رہے تھے۔ میں نے کہا بھی کہ کامریڈ تمہیں مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ ان طاقتوں کے خلاف بولنا چاہیے جو فساد کراتی ہیں، لیکن کون سنتا ہے۔ اس وقت تو لگتا ہے پورا شہر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بٹ گیا ہے۔''

منشی ہر پرشاد نے کامریڈ سورج بھان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ ان کا درد سمجھ رہے تھے۔ وہ کئی دنوں سے کامریڈ کو رات بھر اپنے ساتھیوں سے الجھتے دیکھ رہے تھے، اکثر رات کو کامریڈ سورج بھان ان کے گھر آئے اور غمزدوں کی طرح آہ و زاری کرنے لگتے۔

''سب کچھ ختم ہو رہا ہے منشی جی! ایسے ایسے ساتھی فرقہ پرست ہوگئے ہیں جو پچھلے بیسیوں سال سے اس کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔''

منشی جی سنتے اور خاموشی سے سر ہلاتے رہتے۔ وہ خود دیکھ رہے تھے کہ جو لوگ پچھلے دنگوں میں بڑھ چڑھ کر امن مارچ میں حصہ لیتے تھے یا اختلافات کے خلاف اپنے اپنے محلوں میں لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، وہ بھی ہندو یا مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ حال ہی کے دنوں میں ممکن ہوا تھا کہ پڑوسی کا پڑوسی پر سے یقین ہٹنا شروع ہو گیا تھا۔ پہلی بار انہوں نے دیکھا کہ پڑوسیوں نے پڑوسیوں پر حملہ کیا اور ان کے گھروں میں لوٹ پاٹ کی۔ شاید پچھلے کچھ برسوں سے دونوں فرقوں کے درمیان لگاتار بڑھتے ہوئے زہر کا اثر تھا جس نے حالات کو آخر کار یہاں تک پہنچا دیا تھا۔

افسروں کے پنڈال میں آتے ہی امن کمیٹی کے جو لوگ باہر گھوم رہے تھے، دھیرے دھیرے اندر آنے لگے۔ پریس کانفرنس ختم ہونے کی وجہ سے اخبار والوں میں سے بھی کچھ اس پنڈال میں آ گئے۔

''عزت مآب ضلع مجسٹریٹ، شریمان کپتان صاحب، ہمارے درمیان موجود افسران والا اس شہر کے معزز شہری بہنو اور بھائیو! جس طرح ہر اجلاس کے لیے صدارت کی ضرورت ہے میں مکر جی دادا کا نام اس اجلاس کی صدارت کے لیے پیش کرتا ہوں۔''

''ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔''

جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی مکھر جی دادا صدارت کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ برسوں سے ان جلسوں کی صدارت کر رہے تھے، اس لیے پہلے سے تیار ہو کر آتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی اب اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ صدارت قبول کرنے کے اس تماشے کو ایک ضروری حرکت کے طور پر قبول کرنے لگے تھے۔

مکھر جی دادا کے ایک طرف کلکٹر اور دوسری طرف کپتان بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر دو ممبر اسمبلی اور ایک ممبر پارلیمنٹ بھی بیٹھ گئے تھے۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی، جن صاحب نے صدارت کے لیے نام پیش کیا تھا وہ ماجد صاحب تھے جو پیشے سے وکیل اور کوتوالی کے جلسوں کے مستقل ہدایت کار تھے۔ انہوں نے مائیک ہاتھ میں لیا اور شروعات اپنی تقریر سے کر ڈالی۔ لوگ ان کی اسی عادت سے اوبتے تھے۔ وہ کسی مقرر کو بلانے سے پہلے کافی لمبی تمہید باندھا کرتے تھے۔ شعر و شاعری سے بھری اپنی تمہید کے

بعد وہ اگلے مقرر کو بلاتے اور اس کے مائیک پر آتے آتے اسے تین چار بار وقت کا دھیان رکھنے کی ہدایت دیتے۔ بہت کم مقررین ان کی اس صلاح پر دھیان دیتے۔ اکثر مقررین اور ان کے درمیان مائیک کی چھینا جھپٹی ہو جاتی۔

آج بھی ماجد صاحب نے کئی شعر سنائے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کو یاد دلایا کہ چمن کو سرخ لہو کی نہیں بلکہ سرخ پھولوں کی ضرورت ہے۔ جب لوگ کافی بور ہو گئے اور آوازے کسنے لگے تب انہوں نے مقررین کو بلانا شروع کیا۔

اسٹیج کے پیچھے قنات لگی تھی، اس قنات سے لگ کر چار پانچ مجسٹریٹ اور پولیس افسر کرسیوں کو اس طرح ڈالے بیٹھے تھے کہ ان کی کھسر پھسر اسٹیج پر بیٹھے ان کے اعلیٰ افسروں تک نہ پہنچے۔ جب بھی کوئی مقرر پوری سنجیدگی سے شہر کو جلنے سے بچانے کی اپیل گلا پھاڑ پھاڑ کر کرتا، یہ لوگ اس کی ماں بہن کرنے لگتے۔

''سالا یہاں امن کا اپدیش دے رہا ہے، اپنی گلی میں جا کر چھرے بانٹے گا۔''

''انہیں سالوں کو بند کر دو تو دنگا اپنے آپ رک جائے گا۔''

''لیکن کیسے کردیں؟ افسران انہیں داماد کی طرح کوتوالی میں بلا کر چائے سموسے کھلاتے ہیں۔''

''افسران کیا کریں! نہ کھلائیں تو منتری ڈنڈا کر دے گا۔''

ان کی آواز یا ہنسی کبھی تیز ہو کر اسٹیج کی کرسیوں سے ٹکرانے لگتی۔ کوئی اسٹیج سے آنکھیں نکال کر دیکھتا اور یہ لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ دبا کر تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی کھلکھلاہٹ یا آواز پھر سے بھنبھنانے لگتی۔

''بھائیو! جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہمارے دیش کی نوکر شاہی کو ہماری یاد تبھی آتی ہے جب حالات ان کے کنٹرول سے باہر ہو جاتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جب وقت گلشن کو پڑا لہو ہم نے دیا اور جب آج بہار آئی ہے تو پوچھتے ہیں تم کون ہو؟ پہلے ہمیں یہاں بلایا نہیں گیا۔ بہر حال اب جب بلا ہی لیا گیا ہے تو بتا دیتے ہیں کہ دنگا کیسے کنٹرول ہوگا!...''

''ضرور بتاؤ بیٹا! تم نہیں بتاؤ گے تو دنگا کنٹرول کیسے ہوگا!''

پیچھے کی کرسیوں سے کی گئی یہ سرگوشی اتنی تیز تھی کہ مقرر کے سوا سبھی نے سنا۔ اسٹیج پر

بیٹھے حکام مسکرائے۔ اگلی قطاروں میں بیٹھے لوگوں میں سے کچھ نے دانت نکال دیے، لیکن مقرر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جو بھائی پولیس اور پی اے سی کے خلاف بول رہے ہیں وہ ہمارے دیش کی قوت توڑ رہے ہیں، وہ سی آئی اے اور فلسطین کے ایجنٹ ہیں...''

''فلسطین؟ یہ فلسطین کب سے آگیا دنگا کرانے؟''

''میرا مطلب ہے فلسطین نہیں بلکہ چین... میرا مطلب ہے جاپان...''

''ابے تیرے مطلب سے ہمیں کیا لینا دینا......!''

ہنگامہ ہوگیا اور تھوڑی دیر میں سکون ہوگیا۔ اگلا مقرر بلا لیا گیا، اس طرح کے جلسوں میں تو ایسے ہنگامے ہوتے ہی رہتے تھے، لہٰذا کسی نے زیادہ پروانہیں کی۔

بولنے والے کو چھوڑ کر کسی کو کسی کی تقریر سے دل چسپی نہیں تھی، کبھی کسی شعر یا چٹکلے پر بھلے دوسروں کی توجہ مرکوز ہو جائے، نہیں تو بولنے اور سننے والے اپنی اپنی رو میں بہے جا رہے تھے۔

پنڈت ایودھیا ناتھ دیکشت شہر کے ممبر اسمبلی تھے، اسٹیج پر حکام کے ساتھ بیٹھے تھے، لیکن اپنی تقریر ختم کر کے نیچے چلے گئے تھے۔ وہ پریشان تھے کیوں کہ یہ دنگا ان کے سیاسی کیریئر کے لیے خطرناک تھا۔ پچھلے چناؤ کے وقت بھی دنگا ہوا تھا، لیکن اس وقت دنگا ان کے فائدے میں گیا تھا۔ اس وقت ان کے پرانے حریف رام کشن جیسوال فساد کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چناؤ بالکل سر پر تھا۔ انہیں پورا شک تھا کہ دنگا رام کشن جیسوال ہی نے کرایا ہے۔ رام کشن تھا تو پورا ہندو وادی، لیکن حاجی بدرالدین بیڑی والے سے اس کی پٹتی بھی خوب تھی۔ پورا شہر جانتا تھا کہ جیسوال اور حاجی جب مل کر چاہیں، شہر میں فساد ہو جائے گا۔ چناؤ کے وقت فساد ہونے سے خطرہ یہی تھا کہ ووٹر ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ مسلمان حاجی بدرالدین کے پیچھے غول بند ہوں گے تو ہندو بھی کسی ہندو نیتا کی تلاش میں جیسوال کی حمایت میں اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس چکر میں مارے جائیں گے پنڈت ایودھیا ناتھ دیکشت۔

دیکشت جی اسٹیج سے اتر کر ایک کونے میں کھڑے ہو کر اپنے حامیوں سے بات

چیت کرنے لگے۔ بات کم کر رہے تھے، رام کشن جیسوال کی تگڑم بازی پر دھیان زیادہ رکھ رہے تھے۔ سالا کیسے کلکٹر سے مسکرا مسکرا کر بات کر رہا ہے۔ اس کلکٹر سے بھی نپٹنا ہے۔ کم بخت نے جیسوال کو نیچے سے بلا کر اسٹیج پر بٹھا لیا۔ چناؤ کے اعلان سے پہلے ہٹوانا ہے، بدمعاش جانتا نہیں کہ فساد رام کشن جیسوال اور حاجی بدر الدین نے مل کر کروایا ہے۔ میں نے منع کیا تھا کہ ان لوگوں کو امن کمیٹی کے اجلاس میں نہ بلایا جائے۔ پھر بھی نالائق نے نہ صرف دونوں کو بلایا بلکہ اسٹیج پر اپنے پاس بٹھایا ہے۔ اسی لیے دیکشت جی نے آج تقریر میں ضلع انتظامیہ کی کافی کھنچائی کر دی۔ کہیں کوئی ریلیف تقسیم نہیں ہوئی۔ پورا شہر گندگی سے سڑ رہا ہے اور ضرورت کا سامان نہ ملنے سے فریاد در فریاد کر رہا ہے۔ دیکشت جی یہ بھول کر کہ وہ کسی اجلاس میں شریک ہیں، زور زور سے اپنے حامیوں کے درمیان ضلع انتظامیہ کو کوسنے لگتے ہیں۔

دیکشت جی کی پریشانی سے رام کشن جیسوال اور حاجی بدر الدین بیڑی والے دونوں کو مزہ آ رہا ہے۔ دونوں بیچ بیچ میں ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھ مارتے ہیں۔ دونوں زبردستی مسکرا مسکرا کر کلکٹر سے بات کرتے ہیں۔ دیکشت جی دور سے دیکھ کر دانت پیستے ہیں۔ اس کلکٹر کو تو دنگا ختم ہوتے ہی ہٹوانا ہے۔ کلکٹر بھی اس کیفیت کو سمجھ رہا ہے، اس لیے وہ کنکھیوں سے دیکشت جی کو دیکھتے ہی جیسوال اور حاجی دونوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن دونوں زبردستی جھک کر باری باری اس کے کان میں کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے مجبوراً سر ہلانا پڑتا ہے۔

کلکٹر نے اپنی جگہ بدلنی چاہی۔ وہ جیسوال اور حاجی سے دور بیٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اسٹیج کے کنارے پر پولیس کپتان بیٹھا تھا۔ اس نے کپتان کو اشارہ کر کے جگہ بدلنے کی کوشش کی، لیکن کپتان نے اس کا اشارہ سمجھنے سے انکار کر دیا۔ دراصل اسے کلکٹر کی پریشانی میں مزہ آ رہا تھا۔ کلکٹر نے پچھلے کئی دن سے اسے دکھی کر رکھا تھا۔ وزیروں سے اس کی شکایتیں کی تھیں کہ پولیس اسے پورا تعاون نہیں دے رہی ہے۔ اپنے معتمد اخبار نویسوں کے ذریعہ اس نے پولیس کے خلاف خبریں پلانٹ کرائی تھیں۔ اس لیے کپتان نے بھی آج سے اپنے خاص صحافیوں کو بریف کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایودھیا ناتھ

دیکشت حکمراں جماعت کے ممبر اسمبلی تھے، ان کا استعمال کلکٹر کے خلاف ہوسکتا ہے۔ یہ کپتان کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے دھیرے سے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر اس کے کان میں کہا کہ دیکشت کو جا کر اس اجلاس کے بعد ملنے کو کہے۔ ماتحت اس کا حکم بجالایا۔ کلکٹر نے کپتان کی سرگوشی اور ماتحت کا دیکشت تک جانا دیکھا۔ اس نے کپتان سے نپٹنے کے لئے نئی بساط بچھانی شروع کردی۔

مقررین کی تقریریں اتنی دیر تک چلیں کہ جو بولنے کو رہ گئے تھے انہیں چھوڑ کر سب کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ جنہوں نے اجلاس بلایا تھا وہ بھی بور ہوگئے۔ اسٹیج پر بیٹھے دو تین لوگوں نے ماجد صاحب کو بلا کر ان کے کان میں کچھ کہا۔ ماجد صاحب نے ہر بار سر ہلایا، لیکن ہر بار مائیک خالی ہوتے ہی پہلے اپنے دو تین شعر سنائے، پھر دوسرے مقرر کو بلایا، آخر میں کلکٹر نے ماجد صاحب سے سختی سے کچھ کہا اور انہوں نے صدر کو صدارتی تقریر کے لیے مدعو کیا۔ جو لوگ تقریر کرنے سے رہ گئے تھے انہوں نے ہنگامہ کردیا۔ تھوڑی دیر تک شور شرابے میں کچھ سنائی نہیں دیا۔ اسی افراتفری میں ایک آدھ لوگ آئے اور تقریر کر کے چلے گئے۔ بڑی مشکل سے صدر نے کھڑے ہوکر مائیک پر قبضہ کیا۔

صدر مکھر جی دادا کی تقریر لوگ پچھلے کئی برسوں سے سنتے آرہے تھے۔ آج بھی انہیں پتا تھا کہ کہاں وہ لطیفے سنائیں گے، کہاں تالی بجانی ہے اور کہاں ''شیم شیم'' کی آواز لگانی ہے۔ ایک آدھ جگہ وہ بھول گئے تو حاضرین نے انہیں یاد دلا دیا۔ بہر حال، ان کی تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی لوگ کھڑے ہوگئے اور ان کے آخری الفاظ کرسیوں، قدموں اور لوگوں کی آواز میں دب گئے۔ بغل میں ایک شامیانے میں چائے ناشتے کا انتظام تھا، لوگ اس میں دھنس گئے۔

چائے پان کے دوران چاپلوسی اور خوشامد کے دور چلتے رہے۔ نیتا، افسر، صحافی اور سوشل ورکر بغض، حسد اور جلن کے ساتھ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے ہر موقعے کا استعمال کرتے رہے۔ فساد تو ہر دوسرے تیسرے سال ہونا ہی تھا، اس کے بارے میں بہت فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی بھی سازش کے چھوٹے سے چھوٹے موقعے پر چوکنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے سبھی نے اس موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

8

تلاشیاں جاری تھیں۔ ہر دو تین برس میں اس کی نوبت آتی تھی، اس لیے سب کچھ کافی حد تک حسب معمول سا تھا۔ جس سال فوج آجاتی تھی اس سال فوج کے ذریعے، ورنہ بی ایس ایف، سی آر پی، جو بھی تعینات ہو، اس کے ذریعے شہر کے پاکستانی حصے کو گھیر کر سول پولیس اور پی اے سی کے لوگ تلاشیاں لیتے تھے۔ افسروں کو پورا یقین رہتا تھا کہ فساد اسی حصے کے لوگ کرتے ہیں۔ اس لیے تلاشیاں انہیں علاقوں کی ہوتی تھیں۔ کسی کسی سال جب مرنے والوں میں سبھی یہیں کے لوگ ہوتے تھے تب بھی یہ تلاشیاں صرف انہیں محلوں کی ہوتی تھیں۔ اس بار بھی مرنے والے سبھی لوگ یہیں کے تھے۔ مگر افسروں نے شہر کے پاکستانی حصے کی تلاشی کے طریق کار کا تعین کر کے رات ڈیڑھ بجے سے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

اس دن بھی اس بھری سڑی گرمی کے پسینے میں نہایا ہوا شہر اس وقت ہلکی ٹھنڈی بیار کی خوش فہمی کا شکار ہو چکا تھا۔ صرف وہ لوگ، جنہیں دن بھر کمانے کے بعد ہی رات میں کھانا ملتا ہے اور جن کی بھوکی آنتوں کی اینٹھن نے نیند کو ان آنکھوں سے دور بھگا دیا تھا، نیم خوابیدہ اور نیم بیداری کی حالت میں تھے۔ باقی پورے علاقے میں سونا پڑا ہوا تھا۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک تو ضرور ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعرے ہر طرف لہر کی طرح گھروں کی چھتوں سے ٹکراتے رہے تھے، مگر ایک گھنٹے سے ان کی رفتار بھی کم ہوتے ہوتے قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ یہ نعرے عجیب طرح کا جوش اور خوف پیدا کرتے تھے اور ہر گھر کے رہنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پڑوس ہی میں کوئی

حملہ آور بھیڑ یہ نعرے لگا رہی ہو۔

ڈیڑھ بجے کے بعد گلیوں کے باہر بڑی سڑکوں پر گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سے سڑکوں اور گلیوں کے اندھیرے کونے روشن ہو گئے۔۔ روشنی کے کچھ جھونکے لوگوں کی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے ہو کر اندر گھروں میں بھی پہنچے۔ خوف زدہ ہاتھوں نے جلدی جلدی دروازے بھیڑ دیے۔ اس کے بعد شروع ہوا بوٹوں کا لامتناہی شور۔ ٹرکوں سے کود کود کر جوانوں نے پوزیشن لینی شروع کی۔ رات کے سناٹے میں بوٹوں کی آوازیں ایک خاص طرح کی سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ گھروں میں نیم غنودہ لوگ آنے والی مصیبت کے لیے تیار ہونے لگے۔

کھٹ ...... کھٹ ... ''کھول بے! ... اِبے کھول دروازہ! سالے کہاں اپنی ماں کی گود میں سوئے بیٹھے ہیں۔ کھولتا ہے دروازہ کہ توڑ دوں''؟

آوازیں۔ صرف آوازیں پورے ماحول میں بکھر گئیں۔ آوازیں ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے کی تھیں، آوازیں بوٹوں سے دروازوں پر ٹھوکر مارنے کی تھیں، آوازیں بچوں کے رونے اور عورتوں کے چیخنے کی تھیں، آوازیں کندوں کے پیٹھ یا پیر پر ٹکرانے کی تھیں، آوازوں میں گالیاں، سسکیاں اور گڑگڑاہٹ بھری تھی۔ یہ آوازیں اچانک پیدا ہوئیں اور انہوں نے پورے ماحول کو متھ ڈالا۔

''بہن چو...... اتنی دیر تک دروازہ پیٹتے رہے اب جا کر دروازہ کھولا! اندر اسلحہ چھپا رہے تھے۔''

''بولتے کیوں نہیں سسرے! اب' بان میں تالا لگ گیا ہے؟''

کمرے کے فرش پر بچے نیند میں بے خبر بکھرے تھے اور بالغ افراد دہشت سے حیرت زدہ خاموش بیٹھے تھے۔ دروازہ ٹوٹتے ہی بھڑ بھڑا کر ڈھیر سارے لوگ بندوقوں کے ساتھ اندر گھس آئے۔ مردوں نے عادتاً اپنے ہاتھوں سے سر ڈھک لیا۔ انہیں توقع تھی کہ اب ڈنڈوں، بوٹوں اور بندوق کے بٹوں سے ان کی پٹائی شروع ہوگی۔ پٹائی شروع ہو گئی ہوتی لیکن ایک عورت کی چیخ نے پورے کمرے کی رکی ہوئی ہوا میں کپکپی پیدا کر دی۔

''ہے مولا! اب ہماری بٹیا کی لہاش بوٹن تلے روندی جائے گی!''

کمرے میں گھستے ہوئے لوگ چاروں کونوں میں پھیلنے کے چکر میں نیچے قریب قریب لیٹے ہوئے بچوں کو کچلنے لگے تھے۔ بچوں کے بیچ میں چادر سے ڈھکی ہوئی لاش تھی، جیسے ہی کوئی بوٹ اس پر پڑنے کو ہوا، سعیدہ کی چیخ نکل گئی۔

''کیا بکتی ہے؟ کس کی لاش ہے؟''

سعیدہ نے جواب دیے بغیر رونا جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ساس اور نند نے بھی رونا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے بڑی مشکل سے وضاحت کی۔ ہڑ بڑائے ہوئے سارے بوٹ باہر نکل گئے۔ دروازہ بند نہیں ہوسکتا تھا۔ بوڑھے نے ٹوٹے ہوئے دروازے کے پلوں کو بھیڑ کر ان پر ایک ٹوٹی میز لگا دی۔ باہر کا منظر ضرور ان ٹوٹے پلوں سے اوجھل ہو گیا، لیکن آوازیں آتی رہیں۔

''اس بکسے میں کیا ہے؟ کھول... کھول...... اسے بھی!''

''حضور مائی باپ لڑکی کے زیور گریاں ہیں، اسی جاڑے میں شادی کرنی ہے۔''

''کھول تو دیکھیں تبھی تو پتا چلے گا کہ زیور ہیں یا بم چھپا کر رکھا ہے۔ تم لوگوں کا کوئی بھروسا ویسے بھی نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان سے لا لا کر بم پستول اکٹھا کرتے ہو۔''

''کھول سالے۔ ایک ایک گھر میں اتنی دیر کریں گے تو وہ ہی گھر میں صبح ہو جائے گی۔''

''سیدھے سے نہیں کھولے گا تو منہ بھی توڑ دیں گے اور تالا بھی۔''

بندوق کا کندا دونوں کو توڑ سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تالا ٹوٹتے وقت تیز آواز کرتا ہے اور آدمی کا منہ صرف ادھوری سی ''اوہ!'' کی فریاد نکال پاتا ہے۔

''حضور! بڑی مشکل سے اکٹھا کیا ہے۔ بٹیا کی شادی نہیں ہو پائے گی۔''

پتلون کی جیب میں پڑے ہوئے ہاتھ پر کمزور تھرتھراتا ہاتھ جھول جاتا ہے۔ کندے کی دوسری چوٹ کسی کو اس لائق نہیں چھوڑتی کہ وہ مضبوط ہاتھ کو پکڑنے کی پھر جرأت کرے۔ جب تک بوٹ باہر نکلتے ہیں، گھر کے سارے مرد عورت رونے چلانے لگتے ہیں۔ بچے بھی گھبرا کر ذرا زیادہ اونچی آواز میں روتے ہیں، لیکن جانے والوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

تلاشی کا اختتام تقریباً سبھی گھروں میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ آخر میں سیاہ، راکھ پتے

چہرے اگر آنسوؤں سے تر نہیں ہوتے تو بے عزتی اور غم سے بجھے بجھے، جاتے ہوئے بوٹوں کی آواز سنتے رہتے ہیں۔

''ابے دروازہ اتنی دیر میں کیوں کھولا؟''

''سو رہا تھا، نیند کھلی تو کھولا۔''

''کیا؟ زبان لڑاتا ہے!'' تڑاق... تڑاق...

''مارا کیوں؟ مارنے کا اختیار کس نے دیا تمہیں؟''

''سالا اختیار پوچھتا ہے؟ اس نے دیا اختیار!''

رائفل کا بٹ آدھا منہ پر اور آدھا دروازے پر پڑتا ہے۔ بیچ سے منہ سے خون تھوکا جاتا ہے اور خون کے ساتھ ساتھ دو تین دانت بھی باہر آ گرتے ہیں۔ گھر کے بزرگ عورت مرد آ کر جوان سے چمٹ جاتے ہیں۔ گھر کا بوڑھا کھیا خون دیکھ کر اشتعال میں دھیرے دھیرے کانپنے لگتا ہے۔ سامنے کھڑے مجسٹریٹ سے آواز پر قابو کر کے بات کرنے کی کوشش کرتے کرتے بھی اس کی آواز دھیرے دھیرے تلخ ہونے لگتی ہے۔

''آپ کے سامنے سب کچھ ہو رہا ہے اور آپ چپ چاپ دیکھ رہے ہیں، یہی تلاشی کا انداز ہے؟ کس قانون نے آپ کو اختیار دیا ہے مارنے پیٹنے کا؟ میں بھی وکیل رہا ہوں، اس ملک میں نظام حکومت ہے... قانون ہے... قاعدہ ہے...''

''تو ہمیں قانون قاعدہ سکھائے گا؟ وکیل کی دُم...''

دنیا کا کوئی بوڑھا چہرہ اپنے اوپر بندوق کا کندا برداشت کر خاموش کھڑا نہیں رہ سکتا۔

''سالے کھاتے یہاں کا ہیں، دیکھتے پاکستان کی طرف ہیں، غور سے تلاشی لینا۔ اس بدمعاش وکیل کے یہاں ٹرانس میٹر بھی ہوگا۔ یہی سالے خبر دیتے ہیں، تبھی صبح صبح بی بی سی بولنے لگتا ہے۔''

''پاکستانی...'' خون بھرے منہ کو بے ڈھنگے پن سے چبا چبا کر نوجوان چہرہ پھنکارتا ہے۔ ''پہلے تو نہیں کرتے تھے، لیکن اب ضرور کریں گے پاکستانی جاسوسی... اس سالے ملک میں اگر ذلت ہی ملنی ہے تو ضرور کریں گے پاکستانی دلالی...''

''کیا کہا؟ کیا کہا...... پاکستانی جاسوس ہے۔ تب تو پورا ہی بتائے گا کہ کہاں چھپا

رکھا ہے ٹرانس میٹر اور بم؟''

بگڑا ہوا منہ تھوڑا اور بگڑ جاتا ہے، لیکن عورتیں اس کے اوپر لگ بھگ لیٹ جاتی ہیں۔

باپ کے گال کی پھٹی ہوئی کھال دیکھ کر نوجوان پر بیچ بیچ میں جیسے ہسٹیریا کے دورے پڑتے جارہے تھے۔ اسے بولنے سے روکنے کے لیے بوڑھے وکیل سمیت گھر کے سبھی افراد اسے گھیر کر بیٹھ گئے۔ کوئی بہلا کر، کوئی پھسلا کر، کوئی ڈپٹ کر اسے چپ کرانے کی کوشش کررہا تھا، مگر اس کے باوجود اس کی آواز تیز ہوجاتی تو کوئی نہ کوئی عورت اس سے تیز آواز میں اسے روکر اس کی آواز دبانے کی کوشش کرتی۔

تلاشی لینے والوں کی دل چسپی اس میں ختم ہوچکی تھی۔ دو جوانوں کو ان کے پاس کھڑا کر کے باقی سب لوگ تلاشی لینے چلے گئے۔ کافی مالدار لوگوں کا گھر لگتا تھا۔ اس لیے سب تلاشی لینے والے پوری طبیعت سے تلاشی لے رہے تھے۔ جن دو جوانوں کو گھر والوں کے سر پر کھڑا کیا گیا تھا، وہ بھی تھوڑی دیر میں اندر سرک گئے اور تلاشی میں شریک ہوگئے۔ گھر والے باہر کمرے میں دائرہ بنا کر صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کو تسلی دیتے یا چپ کراتے رہے۔ تلاشی لینے والے جب چلے گئے تو عورتوں نے جھپٹ کر اپنے زیوروں کے بکسوں یا نقدی کے ڈبے کو الٹ پلٹ کر رونا پیٹنا شروع کردیا۔ مردوں نے انہیں ڈانٹا اور بوڑھے وکیل نے بڑھ کر دروازہ بند کردیا۔

قریب قریب سبھی گھروں میں یہی تماشا ہوا۔ صرف حاجی بدر الدین کے یہاں ناٹک کے مکالمے بدل گئے۔ ان کا دو ایکڑ میں پھیلا مکان تھا، گھنے خوب صورت پام کے نیچے پھیلے لان میں مدھم نیلی روشنی پھیلی تھی۔ مکان کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں، اس لیے باہر سے اندر کا کوئی منظر دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ مکان کا بڑا دروازہ کھول کر جب ایک ڈپٹی کلکٹر اور ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں پولیس کا گروہ اندر گھسا تو انہیں لگا جیسے تپتے ہوئے ریگستان سے نکل کر وہ کسی سہانے ٹھنڈے نخلستان میں چلے آئے ہوں۔

''یہ کرفیو میں کیسا مجمع لگا رکھا ہے؟'' بولنے والے نے اپنی آواز میں کڑک بھرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی کڑک کا سننے والوں پر کوئی اثر نہیں پڑا کیونکہ جملہ ختم ہوتے

ہوتے وہ پھس سے ہنس پڑا۔

''آیئے حضور ڈپٹی صاحب...... کیسا کرفیو اور کہاں کا کرفیو! ہم تو اپنے گھر کے اندر بیٹھے ہیں۔''

تھوڑی دیر تک آپس میں اس بات پر دوستانہ بحث ہوتی رہی کہ کرفیو گھر کے اندرونی حصوں تک تھا یا باہر کی چار دیواری تک اس کی حد تھی۔ سپاہی لان کے باہر سیڑھیوں پر آرام سے بیٹھ گئے اور افسران گلاب کی باڑیں پھلانگتے ہوئے لان پر پڑی کرسیوں پر جا کر پھیل گئے۔ تھکان اور کئی دنوں کی جاگ نے سب کو بری طرح توڑ ڈالا۔ کمر سیدھی ہوتے ہی زیادہ تر لوگ اونگھنے لگے۔ حاجی کے آدمیوں نے جلدی جلدی ٹھنڈا پانی اور شربت پیش کرنا شروع کر دیا۔

''اور کیا خدمت کریں صاحب؟ ایسا وقت ہے کہ کچھ خدمت بھی نہیں کر پا رہے ہیں۔''

''ارے بہت ہے حاجی جی، آج تو آپ کا ٹھنڈا پانی بھی امرت لگ رہا ہے۔''

''تھوڑا سا اچھا مال بھی رکھا ہے۔ اجازت دیں تو منگواؤں؟''

''نہیں نہیں ...اس وقت اچھا برا کچھ نہیں چلے گا۔'' افسر نے کنکھیوں سے دور بیٹھے ماتحتوں کی طرف دیکھا۔

''اندر کمرے میں انتظام کرا دیتا ہوں، تھوڑا لے لیں۔ تھکان دور ہو جائے گی۔''

''رہنے دیں حاجی جی پھر کسی دن بیٹھیں گے۔''

اچانک ایک افسر نے لان کے ایک کونے میں دیکھا کہ اندھیرے میں رکھی کرسی پر کسی نے کروٹ بدلی۔ کرسی مہندی کی جھاڑیوں کی آڑ میں اس طرح پڑی تھی کہ بہت دھیان دے کر دیکھنے پر ہی صاف دکھائی پڑ سکتی تھی، افسر نے چوکنا ہو کر پوچھا: ''کون ہے...... ادھر جھاڑیوں کے پیچھے کون ہے؟''

''ارے جیسوال جی، آجائیں۔ ادھر ہی آ کر بیٹھیے۔ نہیں تو صاحب لوگ سوچیں گے کہ میں نے کسی ہندو کو اغوا کر رکھا ہے۔''

رام کرشن جیسوال کچھ ٹپٹائے سے جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر آ گئے۔ جیسوال جی سابق ممبر اسمبلی تھے اور آنے والے چناؤ میں بھی کھڑے ہونے والے تھے۔ حاجی

بدر الدین ان کے پرانے حریف تھے۔ مگر اس بار شہر میں افواہ تھی کہ موجودہ ممبر اسمبلی ایودھیا ناتھ دیکشت کے خلاف دونوں نے ہاتھ ملا رکھا تھا۔

''جیسوال جی کرفیو میں اتنی رات گئے آپ یہاں؟ خیریت تو ہے؟'' ایک افسر نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''ہم تو ڈپٹی صاحب! شہر کے اندیشے سے پریشان ہیں۔ حاجی جی سے ڈسکس کرنے گلیوں گلیوں چھپتے آ گئے تھے۔ دنگا کیسے روکا جائے، اسی پر بات کر رہے تھے کہ آپ آ گئے۔''

''سالا کیسی بھولی بات کر رہا ہے! پورا شہر جانتا ہے کہ یہی دونوں دنگا کروا رہے ہیں مگر ان کو پکڑے گا کون'' دور سیڑھیوں پر بیٹھے ایک داروغہ نے دوسرے کے کان میں پھسپھسا کر کہا۔

''چپ رہ یار! کیوں برا بنتا ہے! یہ کم بخت تو پردے کے پیچھے رہ کر کام کرتے ہیں اور ان کا پیسا سب کچھ کراتا ہے۔ انہیں کون پکڑے گا اور کیوں؟'' دوسرے نے اپنی آواز کو دباتے ہوئے کہا۔

ڈی ایس پی نے ڈپٹی کلکٹر کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا اور دونوں لان کے کونے میں چلے گئے۔

''مجھے بھائی صاحب کچھ گڑبڑ لگ رہا ہے۔ جیسوال کا اس وقت یہاں ہونا شک پیدا کرتا ہے، کہیے تو اندر تلاشی لی جائے، کچھ مل سکتا ہے۔''

''آپ بھی شرما جی بچوں جیسی بات کرتے ہیں! حاجی کیا اپنے گھر میں اسلحہ رکھے گا؟ یا جیسوال خود چاقو چلائے گا؟ ارے ان کا تو صرف پیسا اور دماغ کام کرتا ہے۔ ان کے یہاں تلاشی لینے سے کیا ملے گا؟ کل ہمارا تبادلہ ضرور ہو جائے گا۔''

دونوں دیر تک کھڑے دھیمی آواز میں بات کرتے رہے۔ لان میں بیٹھے حاجی اور جیسوال تھوڑی بے چینی سے ان کی بات چیت ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جیسوال بات چیت کو لمبا کھنچتے دیکھ کر نروس ہونے لگا، لیکن حاجی اسے ہاتھ یا آنکھ کے اشارے سے لگاتار مطمئن کرتا رہا۔ دونوں افسر واپس آ کر بیٹھ گئے۔ بات چیت پھر

شروع ہوگئی۔ جیسوال نے بتایا کہ حاجی جی نے کس طرح محلے کے غریب ہندوؤں کے لیے لنگر کھول رکھا ہے۔ ان کے آدمیوں کو آسانی سے کرفیو پاس نہیں مل پا رہے ہیں اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی سب تک مدد نہیں پہنچا پا رہے ہیں۔ حاجی نے بھی جیسوال کے ذریعے اپنے پڑوسی مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دینے کی بات افسروں کو سنائی۔ اس دوران اندر سے چائے بن کر آ گئی۔

''ابھی تو ٹھنڈا پیا ہے۔ اب چائے کا تکلف کیوں!''

''تکلف کیسا صاحب! میں تو شرمندہ ہوں کہ ایسے موقعے پر آپ تشریف لائے ہیں کہ کچھ خاطر نہیں کر پا رہا ہوں۔''

''کبھی فرصت سے پروگرام بنائیے، بیگم صاحب مرغا بہت اچھا پکاتی ہیں۔ حاجی جی، اب کرفیو ہٹے تو صاحب لوگوں کو دعوت دیجیے۔'' جیسوال نے کہا۔

''میں تو ہمیشہ خدمت کو حاضر ہوں۔ آپ لوگوں کو جب فرصت ہو...''

''دیکھیں گے... رکھیں گے حاجی جی۔ بس کرفیو سے جلدی آپ لوگ چھٹی دلائیے۔''

''اجی میری اور جیسوال کی طرف سے تو آپ کرفیو کل ہٹاتے ہوں تو آج ہٹا لیجیے۔ ہم تو امن کے لیے کوئی بھی قربانی دے سکتے ہیں۔''

''سو تو ہے ... میرا مطلب ہے کہ جو دنگا کرا رہے ہیں وہ فرصت دیں تو دعوت داوت بھی تبھی رکھی جا سکتی ہے۔''

افسر کھڑے ہوئے۔ ماتحتوں نے بھی دھول جھاڑی، اپنی بندوقیں وغیرہ سنبھالتے ہوئے اٹھ گئے۔ آٹھ دس لوگوں کا قافلہ دھیرے دھیرے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ پھاٹک پر کھڑے ہوکر حاجی بدر الدین نے ہاتھ پیشانی تک لاکر سلام کیا۔ ''اب اس سے باہر نکلنے کے لیے تو آپ سے پاس لینا پڑے گا۔''

جیسوال اور افسر دھیرے سے ہنسے۔ ایک ایک کر کے گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں اور حاجی نے بڑا دروازہ دھیرے دھیرے بند کر دیا۔ سناٹے میں تھوڑی دیر تک صرف گاڑیوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور ہیڈ لائٹس کی روشنی گلیوں کی دیواروں پر ناچتی رہی۔

9

باہر جب تک دروازوں کے پھٹنے ٹوٹنے، گلیوں میں بوٹوں کے دوڑنے چلنے یا لوگوں کے چیخنے سسکنے کی آوازیں آتی رہیں، تب تک گھر میں سبھی افراد ڈرے سہمے بیٹھے رہے۔ آوازیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ تلاشیاں چل رہی ہیں۔ یہ گھر تلاشی لینے والوں کی مستعدی سے ڈرے ہوئے لوگوں کا تھا۔ تلاشیوں کا سلسلہ اتنا لمبا کھنچ رہا تھا کہ ناتمام سا لگنے لگا تھا۔ کسی طرح یہ سلسلہ ختم ہونے کو آیا اور آوازیں دھیرے دھیرے ختم ہوگئیں۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ساتھ بہت سی چھوٹی اور بڑی گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں۔ اس لیے ان کی آواز حملہ آور شہد کی مکھیوں کی طرح پوری گلی میں چھا گئی۔ بہت سی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی ایک دم پوری گلی روشنی میں نہاتی چلی گئی۔ جب اس روشنی سے نجات پا کر گلی پھر سے اندھیرے کی تاریکی میں کھوگئی تب گھر کے لوگوں کو یقین ہوگیا کہ تلاشی ختم ہوگئی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر اونگھنا شروع کر دیا۔

پڑوس کے کنجڑے کے مرغ نے غیر فطری طور سے بانگ دی۔ شاید رات بھر کی بے چینی نے اسے غصے سے بھر دیا تھا۔ اس کے کڑکڑانے کی آواز نے سعیدہ کی ساس کو سب سے پہلے جگایا۔ بڑھیا ویسے بھی بہت ہلکی نیند سوتی تھی۔ آج تو اسے ڈھنگ سے نیند آئی بھی نہیں تھی۔ اس نے جھپٹ کر کونے میں پڑے اسٹول پر رکھی میز گھڑی میں وقت دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک تو گھڑی بہت چھوٹی تھی، دوسرے اسٹول پر ایک صراحی بھی رکھی ہوئی تھی جس کی آڑ کی وجہ سے گھڑی کی سوئی صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

بڑھیا نے مدد کے لیے کمرے میں نظر دوڑائی، دیوار سے سر ٹکائے لیٹے لوگوں کو دیکھنے سے یہ تو عیاں ہوگیا کہ ان میں سے کچھ آنکھیں مو ندے جاگ رہے ہیں، لیکن ان میں سے کسی سے بھی مدد کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

بڑھیا خود ہی اٹھی اور اس نے صراحی کو سرکا کر گھڑی کو دیکھا۔ چار بجنے والے تھے، بڑھیا گھبراہٹ کے مارے بے چین ہوگئی، اس نے صراحی کو ہلا کر تھاہ لی۔ صراحی بالکل خالی تھی۔ کل دن بھر اسے بھرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جو کچھ پیندے میں پانی کے قطرے تھے انہیں بھی صراحی کو دو تین بار پورا الٹ کر بچوں نے نچوڑ ڈالا تھا۔ بڑھیا نے پیچھے برآمدے میں باورچی خانے میں جا کر دیکھا، بالٹی میں قریب دو ڈھائی لوٹے پانی تھا۔ گھر کے اکیلے نل سے سوں ......سوں کی آواز آرہی تھی۔ مطلب یہ کہ پانی جلد ہی آنے والا تھا۔ اس نے بالٹی نل کے نیچے لگادی اور نل پورا کھول دیا، حالانکہ نل پورا کھولنا اس گھر میں محاورے سے زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا۔ نل چاہے جتنا بھی کھولا جائے پانی ہمیشہ ایک پتلی سی دھار کی شکل میں گرتا تھا جس سے بالٹی بھرنے سے پہلے آدمی کا صبر جواب دے جاتا تھا۔

بڑھیا نے بالٹی میں موجود دو لوٹے پانی سے اپنے روز مرہ کے کام نپٹانے شروع کیے۔ جب وہ پاخانے سے باہر نکلی تو نل سے دھیرے دھیرے پانی ٹپکنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ نل کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اونگھتے ہوئے بالٹی کے تھوڑا بہت بھر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ رات بھر کی جاگ نے اسے قریب قریب نیند کی حالت میں پہنچا دیا۔ ہوشیار وہ تب ہوئی جب اس کا سر نل کے پاس کھمبے سے ٹکرایا۔ اس نے ہڑ بڑا کر دیکھا پانی تقریباً ایک چوتھائی بھر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کافی دیر آنکھیں بند کیے پڑی رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ایک لوٹے سے پانی نکالا۔ ایک چھوٹی سی، کافی گھسی ہوئی صابن کی بٹی پڑی تھی۔ اس سے اس نے اپنا ہاتھ مل مل کر دھویا۔ بٹی اتنی چھوٹی تھی کہ کافی رگڑنے کے بعد بھی اس میں جھاگ پیدا نہیں ہوا اور تھوڑا سا زور لگنے پر وہ پھسل کر نالی میں گر گئی۔ کوئی دن ہوتا تو بڑھیا اسے نالی سے چھان کر اٹھا لیتی، لیکن آج اس کا دل جاگ کی تھکان اور گھر میں پڑی بچی کی لاش سے اتنا بے حال تھا کہ اس نے صابن

کے ٹکڑے کی پروا نہیں کی جسے وہ کم سے کم دو تین دن اور چلاتی اور اگر گھر کے کسی اور بچے یا جوان سے یہ بڑی نالی میں گر گئی ہوتی تو گھنٹوں اس پر چیختی چلاتی۔

ہاتھ اور منہ پر ٹھنڈا پانی پڑنے سے اس کے بدن میں کچھ پھرتی آئی۔ وہ اپنے کرتے اور شلوار سے اپنا ہاتھ رگڑتے ہوئے جلدی جلدی اندر آئی۔ پانی جلد جا سکتا تھا، اگر تب تک سب لوگ اپنے کام کر لیں تو لاش کے غسل کا انتظام کیا جائے حالانکہ اس کا برسوں کا تجربہ یہ بتاتا تھا کہ گھر میں اتنا پانی نہیں آسکتا، لیکن پھر بھی باہر سے پانی بھرنے کا خیال اتنا اذیت ناک تھا کہ اس نے پورے جی سے چاہا کہ لوگ اتنی جلدی اپنے کام پورے کر لیں کہ باہر جانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ دن بھر پینے کے پانی کی قلت رہے گی، اسے تو بعد میں دیکھ لیں گے۔ قبرستان سے لوٹتے ہوئے گھر کے مرد پانی کی سبیل کر لیں گے۔

اندر سبھی لوگ ابھی سوئے ہوئے تھے۔ صرف بوڑھا اپنی آنکھیں کھولے مستقل جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے جان پتلیوں کو دیکھ کر آسانی سے یہ بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا آنکھیں کھول کر سو رہا ہے۔ سعیدہ کی گردن دیوار پر ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ اس کے کھلے منہ سے رال ٹپک کر اس کے آنچل سے ہوتی ہوئی اس کے گھٹنے تک چلی گئی تھی۔ رات بھر رہ رہ کر ماتم کرنے اور جاگنے کی وجہ سے اس کا کھلا ہوا منہ بے ڈول لگ رہا تھا۔ بڑھیا کا جی چاہا کہ دھیرے سے اس کا منہ بند کر دے اور رال پونچھ کر اسے چپ چاپ تھوڑی دیر سونے دے، لیکن عادت سے مجبور اس کے منہ سے نکل ہی گیا۔

''اری اٹھ کرم جلی، اب کیا دوپہر تک سوتی رہے گی۔''

حالاں کہ بڑھیا کی آواز روز کی طرح کرخت نہیں ہو پائی تھی پھر بھی اس کی تیزی کی وجہ سے سعیدہ نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے اس کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی ہے اور اس نے جھپٹ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پوری طرح اٹھنے سے پہلے اس کی نگاہ سامنے فرش پر چادر سے ڈھکی اپنی چھوٹی بچی پر پڑی اور ایک بار پھر اس کا ماتم شروع ہو گیا۔ پہلے اس نے سسکیاں بھریں،

پھر ایک دم گلا پھاڑ کر رونے لگی۔ اس نے پچھلے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس لیے جلد ہی اس کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔

سعیدہ کے رونے نے کمرے میں فرش پر پڑے سب بڑے لوگوں کو جگا دیا۔ بچے اب بھی سو رہے تھے، لیکن بڑوں نے ایک ایک کر کے اپنی جگہ سے اٹھنا شروع کر دیا۔ بڑھیا نے سب کو جلدی جلدی اپنے روز کے کام نپٹانے کے لیے للکارا۔ لوگوں نے ایک ایک کر کے پیچھے برآمدے کی طرف جانا شروع کر دیا۔

نل لگاتار کھلا رہا، لیکن بالٹی صرف ایک بھر پائی اس کا پہلے ہی سے بڑھیا کو اندازہ تھا۔ نل سے پانی جب آنا بند ہوا تو بالٹی کی تہہ میں صرف تھوڑا سا پانی اور بچا تھا۔ ابھی سارے بچے باقی تھے۔ اٹھتے ہی انہیں پانی کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے علاوہ سب سے ضروری کام لاش کو نہلانا تھا۔ بچی کو مرے بارہ گھنٹے ہوگئے تھے۔ رات میں یوں موسم بہت گرم نہیں تھا، لیکن جلد ہی موسم گرمانے لگے گا اور لاش میں سڑن اور بدبو شروع ہوجائے گی۔ اس لیے بڑھیا چاہتی تھی کہ جلدی سے پانی کا انتظام ہوجائے تاکہ دفنانے کے لیے گھر سے نکلنے کی سبیل کی جا سکے۔

پانی صرف باہر کے سرکاری نل سے مل سکتا تھا۔ سعیدہ کا شوہر پچھلی صبح کا واقعہ ابھی بھولا نہیں تھا۔ بوڑھا کرفیو پاس بنوانے میں جتنا ذلیل ہوا تھا، اس کے بعد اس کی بھی ہمت نہیں تھی کہ باہر نکلے۔ حالانکہ اب اس کے پاس کرفیو پاس تھا اور اسے لے کر باہر پانی لینے نکلا جا سکتا تھا، لیکن پھر بھی باہر پولیس والوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ انہیں کرفیو پاس پھاڑ کر پھینکنے اور اس کی پٹائی کرنے میں کوئی وقت نہیں لگتا تھا۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش زور مار رہی تھی کہ بڑھیا ہی پانی لانے باہر چلی جائے۔ اپنے کسی بھی لڑکے کو وہ باہر نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ روز بڑھیا یا گھر کی دوسری عورتیں ہی جاتی تھیں۔ کسی جوان عورت کا باہر جانا ٹھیک نہیں تھا، لیکن بڑھیا کے جانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا، آخر میں بڑھیا ہی گئی۔

دونوں ہاتھوں میں ایک ایک خالی بالٹی لٹکائے بڑھیا کو پچاس میٹر کی خالی ویران گلی کو پار کرنے میں پورا ایک یگ لگا۔ بڑی مشکل سے گلی کا وہ موڑ آیا جہاں نل لگا ہوا تھا۔

موڑ کے بائیں ہاتھ پر نل تھا اور موڑ پر پہنچنے پر ہی دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا نل پورا کھلا ہوا ہے۔ کیوں کہ تھوڑی دور ہی سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی تھی۔ روز کا وقت ہوتا تو موڑ سے پہلے ہی زمین پر قطار میں رکھے برتن دکھائی دینے لگتے اور اوجھل نل کا احساس کرانے لگتے۔ آج تو وہ جب موڑ پر پہنچی تب اس نے دیکھا، ایک پولیس والا اپنے دونوں ہاتھوں کو چلو کی طرح بنا کر اس میں پانی روک رہا تھا اور چلو بھرنے پر اس پانی کو اپنے چہرے پر مار کر چہرہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑھیا ایک لمحے کو ٹھٹکی، لیکن اب واپس لوٹنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتی گئی اور پولیس والے کے قریب پہنچ کر سہمی سی کھڑی ہوگئی، پولیس والے کی پیٹھ بڑھیا کی طرف تھی، جیسے ہی وہ پیچھے کو گھوما اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ بھر گئی۔

''ارے کہاں صبح صبح آ گئی بڑھیا! جلدی پانی بھر کر بھاگ اپنے گھر۔'' وہ تھوڑی دور پر آگے بیٹھے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

بڑھیا کو اتنے کم میں چھٹکارے کی امید نہیں تھی۔ وہ جلدی جلدی دونوں بالٹیاں بھر کر واپس لپکی۔ گھر کے اندر دونوں بالٹیوں میں پانی بھرے جب وہ گھسی تو گھر کے مردوں کے بیچ وہ انتہائی غرور سے بھری تھی۔ اس نے دونوں بالٹیوں کا پانی گھر میں جتنے بھی برتن موجود تھے ان میں بھرا اور ایک بار پھر نل پر جانے کے لیے گھر سے نکلی۔

اس بار بڑھیا کو کامیابی نہیں ہوئی۔ گھر سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھنے پر اسے گالی گلوچ اور زمین پر ڈنڈا پٹکنے کی آواز سنائی دی۔ ہوا یہ کہ گلی میں اس کی آہٹ سن کر کئی لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازوں کھڑکیوں سے اسے پانی لینے جاتے اور پانی لے کر لوٹتے دیکھا۔ لوگوں کو لگا کہ آج اچھا موقع ہے۔ اس گلی میں زیادہ تر لوگوں کو پانی عام نل ہی سے ملتا تھا۔ اس لیے بڑھیا جب دوسری بار باہر نکلی تب کئی گھروں کے مرد اور عورتیں نل کی طرف پہنچ چکے تھے۔ گرمی میں پانی کی ضرورت اتنی بڑی تھی کہ گالیاں سنتے اور پٹتے ہوئے بھی لوگ نل کے ارد گرد منڈلاتے رہے اور گرتے بھاگتے آدھی پونی جتنی بھی بالٹی بھری ہوتی اسے لے کر اپنے گھر میں گھستے رہے۔ بڑھیا نے چالاک بننے کی کوشش کی اور نل کے ارد گرد پھیلی افراتفری میں دونوں بالٹیاں آدھی سے زیادہ بھر لیں،

لیکن واپس مڑتے وقت ایک سپاہی کی لاٹھی اس سے ایسی ٹکرائی کہ دونوں بالٹیوں کے صرف پیندے میں تھوڑا تھوڑا پانی بچا۔ اسی کو لے کر وہ واپس لوٹی۔

کمرے میں واپس گھس کر اس نے پانی نہ لا پانے کی جھنجھلاہٹ سعیدہ پر اتاری۔ سعیدہ جاگنے کے بعد دیوار سے لگ کر آہ وزاری کر رہی تھی۔ اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بڑھیا نے اپنی آواز کو پوری طرح کرخت بنا کر کہا:

''ابھی تک اٹھی نہیں کرم جلی! سارا کام پڑا ہے، یہاں تیری لونڈی کون ہے جو سب کام نپٹائے گی؟ اٹھ ...جلدی اٹھ...''

سعیدہ شروع ہی سے اس سے ڈرتی تھی، اس کی ڈانٹ کا اثر یہ ہوا کہ جب تک بڑھیا اندر بالٹی رکھ کر کمرے میں واپس لوٹی تب تک وہ سیدھی کھڑی ہوگئی تھی۔ بڑھیا کا بڑبڑانا جاری رہا، لیکن سعیدہ نے اسے موقع نہیں دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

جب تک سعیدہ واپس آئی اس کی ساس نے کافی حد تک تیاریاں پوری کر لی تھیں۔ اس وقت وہ پرانی دھلی ہوئی سفید چادر کو سوئی دھاگا لے کر سینے میں مصروف تھی۔ غنیمت تھا کہ کئی بکسوں کو ٹٹولنے کے بعد یہ ایک چادر اسے مل گئی تھی، جسے وہ کفن بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ سعیدہ نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کی، لیکن چادر کو چھوتے ہی رلائی سے اس کا گلا بھنچ گیا اور آنکھوں کی پتلیوں پر پانی کی بوندیں پھیل گئیں۔ ہر چیز دھندلی سی ہوگئی، ساس نے نرمی سے اس کا ہاتھ الگ کر دیا اور اس کے اشارے پر اس کی نند نے سعیدہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر پیچھے دیوار تک سرکا دیا۔ سعیدہ دیوار پر سر ٹکائے پورے سانحے سے سکتے میں پڑ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے میں تیاری پوری ہوئی۔ بچی کو نہلا کر کفن پہنا کر چلنے کی باری آئی تو دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ نماز پڑھی گئی اور تین مردوں کے نکلنے کے لیے دروازہ کھولا گیا۔ تب تک سعیدہ پست اور بے ہوش سی ہوچکی تھی۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی وہ پچھاڑ کھا کر گری اور پوری طاقت سے آہ وزاری کرتے ہوئے اس نے دو تین بار اپنا سر زمین پر پٹخا۔ اس کے شوہر کے ہاتھوں پر بچی کی لاش تھی، جیسے ہی اس کا پہلا پیر گھر سے باہر نکلا، سعیدہ دروازے کی طرف جھپٹی، نہ جانے اس کے ناتواں بدن میں اتنی طاقت

کہاں سے آگئی تھی کہ اسے سنبھالتے سنبھالتے اس کی ساس اور نند گر پڑیں۔

دروازے کی چوکھٹ پر ایک پیر باہر گلی میں لٹکائے اور ایک پیر موڑ کر اندر کمرے میں ڈالے سعیدہ اپنی ساس اور نند کے ساتھ دیر تک روتی رہی۔ سر جھکائے چھوٹی سی لاش کو ہاتھوں پر اٹھائے تین مردوں کی صورتیں دن کے اجالے میں غائب ہو گئیں۔ اڑوس پڑوس کی کھڑکیاں آدھی پوری کھلیں اور پھر تیزی کے ساتھ بند ہو گئیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے پلوں کے سوراخوں سے آنکھیں سٹائے نہ جانے کتنے سر ان پر ٹکے تھے۔

صبح کے سات بجے تھے اور دھوپ پوری شدت کے ساتھ چمک رہی تھی، چوں کہ بیتی رات بہت تھکا دینے والی اور گہما گہمی سے بھرپور تھی، اس لیے اتنا تو گارنٹی سے کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک حاجی بدرالدین اور رام کرشن جیسوال کا ناشتہ میزوں پر نہیں لگا ہوگا اور اعلیٰ حکام کے غسل کے لیے رکھا ہوا پانی بھی غسل خانوں میں انتظار ہی کر رہا ہوگا۔

☆❑☆
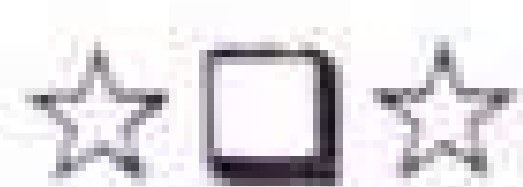
پس نوشت

جب میں نے ''شہر میں کرفیو'' لکھنا شروع کیا تھا تو اس وقت میرے لیے سب سے کارگر چیز وہ تجربات تھے، جو میں نے مختلف فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایک پولیس افسر کی حیثیت سے حاصل کیے تھے۔ یہ تجربات دو طریقوں سے مجھ پر اثر انداز ہوئے۔ بطور پولیس افسر میں نے ایسے موقعوں پر استعمال کرنے کے لیے بہت سی کارآمد پیشہ ورانہ ترکیبیں سیکھیں۔ اس کے ساتھ ان واقعات کے پیچھے چھپے ہوئے بہت سے انسانی المیے بھی مجھ پر آشکارا ہوئے، جنہوں نے میرے اندر کے قلم کار کو ترغیب دی۔ اس مختصر ناول کی تخلیق میں مجھے ان چیزوں سے بہت مدد ملی، میں نے کچھ مختصر افسانے بھی ان ہی کی مدد سے لکھے۔ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح برصغیر میں بھی فرقہ وارانہ تشدد کا سب سے زیادہ نقصان آبادی کے غریب اور کمزور ترین لوگوں کو ہوتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ مجروح طبقہ ہے۔ میں نے اس سچائی کو ایک ایسی فورس میں جس کا مقصد امن قائم کرنا اور برقرار رکھنا ہے، ایک افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران موثر طور پر جانا۔

''شہر میں کرفیو'' ہندی میں شائع ہوا تو اس پر کئی طرح کے ردّعمل سامنے آئے۔ بعض طبقوں نے اس پر شدید ردّعمل کا اظہار کیا۔ اس سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ برصغیر میں فرقہ پرستی اور اس کے مکروہ ترین مظہر یعنی فرقہ وارانہ فسادات کا زیادہ منظم ڈھنگ سے مطالعہ کروں۔ خوش قسمتی سے مجھے نیشنل

پولیس اکیڈمی، حیدر آباد سے فیلو شپ مل گئی۔ اس طرح ہم عصر معاشرے کے ایک سب سے نازک پہلو کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک برس کی مہلت ملی۔ میری تحقیق کا موضوع تھا ''فرقہ وارانہ فسادات کے دوران پولیس کی غیر جانبداری کا تصور'' اس کا سب سے نمایاں مقصد فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ہندوستانی پولیس کے رول کا مطالعہ کرنا تھا۔ لیکن میں نے اس عرصے کو فرقہ پرستی کے موضوع پر دستیاب علمی اور معروضی تحریروں کے علاوہ زیادہ مہارت اور تناظر والی تحریروں کے مطالعے میں بھی استعمال کیا۔ اس کے بعد کے موقعوں پر میں نے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران بطور پولیس افسر جو کچھ جانا، اس سے اپنے قارئین کو واقف کرایا۔ انہیں بتایا کہ ان شدید انسانی المیوں کے مشاہدے سے بطور قلم کار مجھے کیا تخلیقی روشنی ملی۔ اس ایک برس کے دوران مطالعوں سے میں نے کیا فائدہ حاصل کیا۔ مجھے امید ہے کہ یہ بیان اس مختصر ناول کو زیادہ وسیع پس منظر میں سمجھنے کی تحریک دے گا۔

یہ ناول پہلی بار 1987 میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت جو رد عمل سامنے آیا اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے ہم عصر ہندوستانی معاشرے اور اس میں پھیلی ہوئی فرقہ واریت کے افہام و تفہیم میں کچھ مدد ملے گی۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے خالص ادبی بنیادوں پر اس کتاب کی تحسین یا تنقید کی ورنہ ہندی قارئین کے ایک بڑے طبقے نے اس کتاب کو محض اپنے فرقے کی بنیاد پر خوش آمدید کہا یا اسے مسترد کر دیا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد اب تک ہندوستان میں جتنے بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، ان میں ہلاک ہونے والوں میں مسلمان 70 فیصد ہیں۔ رانچی اور بتیا (1967) احمد آباد (1969) بھیونڈی (1970) جلگاؤں (1970) اور بمبئی (93-1992) کے فسادات میں اور رام جنم بھومی، بابری مسجد تنازعہ کے دنوں کے فسادات میں اور پورے ملک میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد کے فسادات میں ہلاک شدہ مسلمانوں کا فی صد 90 سے اوپر تک

پہنچ گیا۔ اس لیے ہندی یا اردو میں اس ناول کے مسلمان قارئین نے یہ محسوس کیا کہ یہ ناول ان کے اس یقین کو تقویت پہنچاتا ہے کہ فسادات کے دوران ہمیشہ ان کے ساتھ بدسلوکی اور تفریق ہوتی ہے۔ اس لیے ایک برس کے اندر ہی اردو کے کئی رسائل اور جرائد میں اس ناول کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا۔ بیشتر چھاپنے والوں نے نہ تو مجھے اس کی اطلاع دی اور نہ ہی مجھ سے اجازت لی۔ مجھے ان کے بارے میں کبھی مہینوں اور کبھی برسوں بعد معلوم ہوا۔ مسلمان مبصرین اور ناقدین نے ایک خاص جوش و خروش کے ساتھ اس ناول کو سراہا ہے۔ لیکن اس ناول کی تحسین و تعریف کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ سچائی محو ہوگئی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت وہی ہے جو جنوبی ایشیا کے دوسرے ملکوں میں اقلیتوں کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہندوؤں کا جو حشر ہورہا ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں کی صعوبتوں اور پریشانیوں سے زیادہ شدید ہے۔ حتیٰ کہ ان مسلم فرقہ پرست تنظیموں نے جو ہندوستان جیسے کثیر مذاہب والے معاشرہ میں اسلامی مملکت کے قیام کے تصور کی بڑی ڈھٹائی کے ساتھ تبلیغ کرتی ہیں، اپنے رسائل و جرائد میں اس ناول کی خوب تشہیر کی۔ بطور قلم کار میرے لیے یہ بہت تکلیف دہ تجربہ تھا۔

ہندوتو کے فاشسٹ علم برداروں کا ردعمل اس کے عین برعکس تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس ناول نے ہندوؤں کو قصوروار فریق بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ وشو ہندو پریشد کے سربراہ شری اشوک سنگھل نے اس ناول پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر اس ناول کو بنیاد بنا کر کوئی فلم تیار کی گئی تو جس ہال میں وہ دکھائی جائے گی، اس کو جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔ اس دوران مجھے سینکڑوں ایسے خطوط ملے جس میں مجھے گالی اور کوسنے دیئے گئے اور ایک 'ہندو دشمن' اور 'مسلم نواز' ناول لکھنے پر میری مذمت کی گئی۔

ڈرامائی طور پر ان دونوں متضاد ردعمل کو سامنے رکھ کر میں نے بطور قلم کار اور بطور ہندو انھیں سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور اپنی فیلوشپ کے دنوں

میں اس معاملہ پر زیادہ توجہ سے غور کیا۔ اس درمیان بعض دلچسپ حقائق سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔

جب بھی یہاں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر غور کیا جاتا ہے، ہندوستان کا اکثریتی فرقہ حقائق کو نظر انداز کر بیٹھتا ہے اور پہلے سے طے شدہ دو باتوں پر ہی اصرار کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ (1) فسادات مسلمان ہی شروع کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ (2) فسادات میں زیادہ تر ہندو مارے جاتے ہیں۔

اس پر بحث کرنے کی گنجائش ہے کہ فسادات کون شروع کرتا ہے لیکن ہلاک ہونے والوں کی پہچان اور تعداد بحث سے بالاتر ہے۔ نہ صرف سچ یہ ہے کہ تقریباً ہر فساد میں مسلمان زیادہ مارے جاتے ہیں بلکہ یہ اور بھی بڑا سچ ہے کہ آدھے سے زیادہ فسادات ایسے ہیں جن میں مارے جانے والوں میں 90 فیصد سے زائد مسلمان تھے۔ لہٰذا اس سے قبل کہ ہم اس سوال پر بات کریں کہ فسادات کون کراتا ہے، فسادات میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد پر گفتگو کی جائے۔

1960 کے بعد ہندوستان میں جو فسادات ہوئے ہیں وہ 1947 میں تقسیم ہند کے وقت برپا ہوئے تشدد سے مختلف ہیں۔ 1960 تک وہ اسباب کم و بیش ختم ہو چکے تھے جو تقسیم ہند کی پیداوار تھے۔ سابق مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آنے والے ہندو رفیوجیوں کے بیان کردہ ہولناک واقعات کے ردّ عمل میں ہونے والے چند فسادات کو الگ کر کے دیکھیں تو بقیہ فسادات کے اسباب کا تقسیم کی کسی ہولناک یاد سے کوئی تعلق نظر نہیں آئے گا۔ بعد میں ہونے والے ان فسادات کا سبب یا تو یہ تھا کہ تقسیم کے بعد بے اثر اور ناکارہ ہونے والی ہندو اور مسلم تنظیموں میں نئے سرے سے جان ڈالی جائے یا پھر یہ کہیں کہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے فسادات کو استعمال کرنے کا رجحان تیزی سے بڑھا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ ان فسادات میں ہلاک ہونے والے تین چوتھائی لوگ مسلمان تھے۔ اس طرح لوٹی یا تباہ کی گئی املاک میں سے بھی 75 فیصد املاک مسلمانوں کی تھیں۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، ان فسادات کے لیے جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان کا زیادہ بڑا فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

پہلے چند بڑے فسادات میں مرنے والوں کی تعداد پر غور کیا جائے۔ 1960 کے بعد سب سے زیادہ بھیانک فساد 1969 میں احمد آباد میں ہوا۔ جسٹس جگموہن ریڈی کی قیادت میں احمد آباد فسادات کی انکوائری کے لیے جو کمیشن بنایا گیا اس کے سامنے ریاستی حکومت کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس فساد میں 6742 مکانوں اور دکانوں کو جلا کر راکھ کیا گیا جن میں صرف 671 ہندوؤں کی ملکیت تھے بقیہ مسلمانوں کے تھے۔ اس فساد میں تباہ کی جانے والی املاک کی پوری قیمت 4,23,24,068 (چار کروڑ 23 لاکھ 24 ہزار 68) روپے تھی۔ اس رقم میں سے ہندوؤں کی جائداد کی قیمت صرف 75,85,845 (پچھتر لاکھ 85 ہزار 845 روپے) ہے جب کہ مسلمانوں کی جائداد کی قیمت 3,47,38,224 (تین کروڑ 47 لاکھ 38 ہزار 224 روپے) تھی۔ اس فساد میں 512 لوگ مارے گئے جن میں صرف 24 ہندو تھے اور 413 مسلمان۔ بقیہ 75 لاشوں کی شناخت نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد بڑا فساد 1970 میں بھیونڈی کا تھا جس میں 78 افراد ہلاک ہوئے۔ ان میں 17 ہندو تھے، 59 مسلمان، 2 لاشوں کی شناخت نہیں ہو پائی۔ جسٹس ڈی۔ پی۔ مدان کی قیادت میں انکوائری کمیشن کے سامنے دیئے گئے بیانات میں اس بات کا انکشاف کیا گیا کہ فساد کے دوران 6 مسلم خواتین کی آبروریزی کی گئی لیکن ایک بھی ہندو عورت کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں ہوئی۔

بھیونڈی کے فسادات کے ردعمل کے طور پر جلگاؤں میں جو فساد ہوا اس میں 43 افراد مارے گئے۔ ان میں صرف ایک ہندو بقیہ سب کے سب مسلمان تھے۔ جلگاؤں میں مسلمانوں کا مالی نقصان 33,90,977 (تینتیس لاکھ 90 ہزار 977) روپے کا تھا جب کہ ہندوؤں کا نقصان 83,725 (تراسی ہزار 725)

روپے کا تھا۔ اس طرح رانچی اور بتیا کے فسادات میں 184 افراد مارے گئے جن میں 164 مسلمان تھے، 19 ہندو اور ایک کی شناخت نہیں کی جاسکی۔

درج بالا فسادات 1960 کے بعد ہندوستان میں ہونے والے بدترین فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ ان کے علاوہ جمشید پور، علی گڑھ، وارانسی اور بمبئی میں بھی بڑے فسادات ہوئے ہیں۔ ان فسادات کے نتائج بھی کم وبیش یہی تھے۔ شاید ایک بھی فساد ایسا نہیں جس میں ہلاک ہونے والوں میں مسلمانوں کا فیصد 70 سے کم ہو۔ املاک کے نقصان کا تناسب بھی یہی تھا۔ تاہم سب سے حیرت انگیز سچ یہ ہے کہ تقریباً ہر فساد میں پولیس نے جن لوگوں کو حراست میں لیا، ان میں سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ اس طرح زیادہ تر مسلمان گھروں کی ہی تلاشی لی گئی۔ بظاہر اکثریتی فرقے کی طرح پولیس بھی یہی سمجھتی ہے کہ فسادات کے لیے مسلمان ذمہ دار ہیں اور وہ اس یقین کے ساتھ کارروائی کرتی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف سخت کارروائی کر کے ہی فسادات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

یہ یقین کہ فسادات میں زیادہ تر ہندو مارے جاتے ہیں، اکثریتی فرقے کے دل و دماغ میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ ایک اوسط ہندو اس سچائی کو تسلیم نہیں کرے گا کہ ان فسادات میں زیادہ جارح فریق ہندو ہوتے ہیں۔ ہم لوگ جب اس رد و قبول کی تحقیقات کرتے ہیں تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ بچپن میں بعض رجحانات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کے اس یقین کو تقویت پہنچاتے ہیں اور اس کے پیچھے پوشیدہ سچائی کو تسلیم نہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہر ہندو بچے کو گھر میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ مسلمان پیدائشی ظالم ہوتا ہے اور کسی کی جان لینے سے بھی نہیں چوکتا جب کہ ہندو نرم دل ہوتے ہیں اور کسی چیونٹی کو بھی نقصان پہنچانا ان کے لیے دشوار ہے۔

اب تو ایسے ہندو جابجا مل جائیں گے جن کو یہ کہتے سنا جاسکتا ہے کہ ارے صاحب کسی ہندو گھر میں آپ کو آلو، پیاز کاٹنے والی چھری کے سوا کوئی ہتھیار نہیں ملے گا۔ یہ ہندو جو بات نہیں کہہ کر بھی کہہ رہا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے گھروں

میں عموماً ہتھیاروں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی عام ہندو کے گلے سے فسادزدگان سے متعلق سرکاری اعداد وشمار کبھی نہیں اترتے۔ جب یہ اعداد وشمار سامنے آتے ہیں تو کوئی بھی حکومت یہ پسند نہیں کرتی کہ ایسے اعداد وشمار عام کرے جن سے یہ ثابت ہو کہ ملک میں اقلیتیں محفوظ نہیں ہیں۔

اکثریتی فرقے کو دوسری غلط فہمی اس سوال پر ہے کہ فسادات شروع کون کراتا ہے؟ یہ یقین بالکل عام ہے کہ ایسی بیشتر وارداتوں میں پہل مسلمانوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ ہندو سرکاری افسر ہو یا ماہر تعلیم، قانون داں ہو یا پولیس افسر، ان کے لیے اس بات پر یقین کر لینا بہت آسان ہے کہ فسادات مسلمان شروع کرتے ہیں۔ وہ اس پر دوبارہ غور کرنے کی زحمت کیے بغیر ہی ہر گفتگو میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ فساد عموماً وہیں ہوتا ہے، جہاں مسلمانوں کی گنجان اور بوسیدہ آبادی ہو۔

ہندوؤں کی اس غلط فہمی کے ازالے کو آسان بنانے کے لیے میں نے پہلے یہ سوال اٹھایا کہ فسادات میں مارا کون جاتا ہے؟ 1960 سے اب تک سو (100) میں ایک بھی ایسا فساد نہیں جس میں مسلمانوں کی جان کا، املاک کا یا عزت کا نقصان ہندوؤں کے اس طرح کے نقصان سے کم ہو۔ بیشتر فسادات میں نہ صرف مسلمانوں کو بھاری نقصانات ہوئے ہیں، بلکہ تناسب کے اعتبار سے ان کا نقصان ہندوؤں کے نقصان سے بہت زیادہ ہے۔ اکثر مجموعی 70 فی صد سے بھی زیادہ، اور یہ کوئی راز نہیں بلکہ ہر کوئی اس سے واقف ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ فسادات کی آگ بھڑکی تو قتل بھی اس کا ہوگا، جائیداد بھی اسی کی لوٹی جلائی جائے گی اور گرفتار بھی اسی کو کیا جائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ یہی سب کچھ ہندو کے ساتھ بھی ہوگا، لیکن بہت چھوٹے پیمانے پر۔ اس صورتحال میں مسلمان فساد شروع کیوں کرے گا؟ کیا ایسا ہے کہ سالہا سال سے پٹتے رہنے کے باوجود مزید سزا بھگتنے کی اس کی بھوک ختم نہیں ہوئی؟ کیا ایسا ہے کہ ایک پورے فرقے نے اجتماعی خودکشی کا فیصلہ

کرر کھا ہو؟ ظاہر ہے کہ ایسی بات سوچتے ہی ہنسی آجاتی ہے لیکن اس کا کسی عام ہندو کی سوچ پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب کہ ''فساد کس نے شروع کیا؟'' ہمیشہ اس امر سے لیا جاتا ہے کہ پہلا پتھر کس نے پھینکا؟ یا آگ پہلے کس نے بھڑکائی؟ اس کا نتیجہ ہمیشہ اس لیے غلط برآمد ہوتا ہے کیونکہ جس ذریعے سے اس تک پہنچا گیا ہے وہ خود اپنے آپ میں غلط ہے۔ جن لوگوں نے فرقہ وارانہ فسادات پر قریب سے نظر رکھی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ پھینکا جانے والا یہ پتھر فساد شروع کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ فساد سے پہلے کسی شہر میں کشیدگی کا ماحول بنایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اصل واقعہ سے مہینوں پہلے سے جھوٹی الزام تراشیوں، افواہوں اور منفی پروپیگنڈوں کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔ کشیدگی مسلسل بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ اس انتہائی نقطہ تک پہنچ جاتی ہے جہاں صرف ایک پتھر یا اشتعال انگیز نعرہ زبردست دھماکے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس زبردست کشیدگی میں اس بات کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ پہلا پتھر کس نے مارا۔ اہمیت ہے تو اس کشیدہ ماحول کی جس سے فساد شروع ہوتا ہے۔ پتھر یا نعرہ محض ایک بہانہ ہے۔

اس معاملہ کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہم لوگ 1970 میں بھیونڈی کے فرقہ وارانہ فسادات کے آغاز پر ایک نظر ڈالیں۔ 7 مئی کو وہاں فساد شروع ہوا تھا۔ شیو (شیواجی) جینتی کا جشن منانے کے لیے ایک جلوس نکالا گیا تھا، جس پر مسلمانوں نے پتھراؤ کیا۔ اس لیے سطحی طور پر دیکھا جائے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ مسلمانوں نے فساد شروع کیا۔ لیکن ہم اگر اس واقعے کے رونما ہونے کی پوری تفصیل پر ذرا گہرائی سے نظر ڈالیں تو فوراً یہ واضح ہو جائے گا کہ اس طرح کا نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے۔ فساد شروع ہونے سے بہت پہلے کچھ دنوں سے بھیونڈی میں فرقہ وارانہ کشیدگی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح مسلمانوں نے مسجد کے

سامنے سے جلوس لے جانے پر اعتراض کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور ان کی مسجد کو رنگوں سے رنگ دیا جائے۔ مقامی انتظامیہ نے مداخلت کی اور دونوں فریقوں کے درمیان ایک معقول سمجھوتہ کرایا۔ جلوس چل پڑا۔ اس جلوس میں شامل لوگوں نے اشتعال انگیز نعرے لگانے شروع کر دیئے اور جو وعدہ کیا تھا، اس کے برعکس مسجد پر رنگ پھینکا۔ نتیجہ میں جو ہونا تھا ہوا۔ مسلمانوں نے جلوس پر پتھراؤ کیا۔ اب اگر اسی کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ نتیجہ اخذ کرے کہ مسلمانوں نے فساد شروع کیا تو وہ لازمی طور پر واقعات کے اس پورے تسلسل کو نظر انداز کر رہا ہے جس کی وجہ سے کشیدگی اس مرحلے تک پہنچ گئی جس میں صرف ایک پتھر ہی ہولناک فساد شروع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

حیدر آباد کے فسادات کے دوران بھی یہ بات سامنے آئی کہ جلوس میں شامل لوگ خود بھی ''پہلا پتھر مار سکتے ہیں۔'' وہاں ہندوؤں کے ایک مذہبی جلوس کے دوران جلوس میں شامل کچھ لوگوں نے خود ہی جلوس پر پتھراؤ کیا۔ چوں کہ جلوس کے بیشتر شرکاء اس حقیقت سے واقف نہیں تھے، اس لیے انھوں نے بہ آسانی قیاس کرلیا کہ پتھر مسلمانوں نے مارا ہوگا اور اس طرح فساد شروع ہوگیا۔

لیکن صرف بحث کی خاطر ہی سہی، ہم لوگ ان واقعات کے تسلسل کو نظر انداز کر دیں جن کی وجہ سے فسادات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے آیئے اس ذہنی حالت کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں جس میں بہت سے موقعوں پر مسلمان پہلا پتھر مارتے ہیں اور فسادات کے آغاز کا سبب بن جاتے ہیں۔ بیشتر صورتوں میں یہ پہلا پتھر ایک خوفزدہ اور غیر محفوظ فرقہ کا بوکھلایا ہوا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ یہ فرقہ اس بات کو جانتے ہوئے بھی کہ نقصان اسی کا ہوگا، پتھر پھینکنے میں پہل کرتا ہے۔ اس فرقے کی غریبی، تعلیم کی کمی اور اس کی پوری طرح موقع پرست قیادت اس طرح کا ردِّ عمل طے کرنے میں بہت اہم رول نبھاتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ فسادات شہر کے ان علاقوں میں ہی ہوتے ہیں جہاں مسلمانوں کی گنجان آبادی ہے۔ اکثر ایسا بھی

ہوتا ہے کہ غریبی اور بے روزگاری سے بر سر پیکار مسلم خاندانوں کے پاس اتنی جگہ بھی نہیں ہوتی کہ خاندان کے تمام لوگ ایک ساتھ سوسکیں۔ آرام کرنے کے لیے گھر کے لوگ باری باری موقع نکالتے ہیں۔ ان گھرانوں کے کوچہ گرد نوجوان افواہوں کی زد میں بہ آسانی آجاتے ہیں۔

اس سے قبل میں نے اکثریتی فرقے کی نفسیات کا ذکر کیا تھا کیوں کہ اس نفسیات کو پوری طرح تبدیل کیے بغیر فرقہ وارانہ فسادات کو روکنا ممکن نہیں ہے۔ اکثریتی فرقے کے مثبت فکر والے لوگوں کو اس کا اعتراف کرنا ہوگا کہ ان کی جارحیت اقلیتی فرقے کے لوگوں کو بار بار اپنا نشانہ بناتی ہے۔ جب کہ اقلیتوں کا بھی اس سرزمین پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اکثریت کا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کے وقت پولیس اور فوج کا کام اکثریتی فرقے کی جانبداری کرنا نہیں بلکہ اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ یہ اعتراف تبھی ہوسکتا ہے جب اکثریتی فرقے کے لوگوں کے طرز فکر میں سچ مچ نمایاں تبدیلی پیدا ہو۔

جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، ان پر بھی لازم ہوتا ہے کہ وہ ان فسادات کے مسئلہ کو بعض دوسرے بڑے سوالات پر غور کرنے کے لیے استعمال کریں۔ سب سے پہلے انہیں اس سچائی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ''دوقومی نظریہ'' کی بنیاد پر ملک کی تقسیم بالکل غلط تھی۔ نہ تو ہندو اور مسلمان دوقومیں ہوسکتی ہیں اور نہ ہی صرف مذہب کی بنیاد پر کوئی ملک قائم رہ سکتا ہے۔ ہندوستان کا ہندو اور مسلمان ایک ہی سماجی، اقتصادی اور لسانی پس منظر کی وجہ سے ایک دوسرے سے ایسے دو دیگر افراد کے مقابلے میں زیادہ قریب ہیں، جن کے مذہب تو ایک ہیں مگر وہ ایک ہی ثقافتی ورثے میں حصے دار نہیں۔

''کیا ہندوستان صرف مسلمانوں کی وجہ سے تقسیم ہوا'' یا ''تقسیم کرانے میں مسلمانوں کا رول کتنا نمایاں تھا'' یا ''کس حد تک ہم عصر ہندوؤں نے مسلمانوں کو خواستہ ناخواستہ ملک کی تقسیم کے عمل میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔'' اس طرح

کے سوالوں میں الجھنے سے کوئی مقصد حاصل نہ ہوگا۔ ان معاملات میں سر کھپائے بغیر ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ مسلمہ سچ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہندو اور مسلمان کے الگ قوم ہونے کا تصور مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ پارٹی مسلم لیگ اور ان کے سب سے بڑے عوامی لیڈر محمد علی جناح نے پیش کیا تھا۔ اگر ہندوستانی مسلمان اسے تسلیم کریں کہ ہندوستان کی تقسیم غلط تھی اور یہ کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں نہیں ہیں تو اس سے ہم تمام لوگوں کو تقسیم ہند کی ہولناک یادوں سے نجات حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

اس کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک دلچسپ مگر تکلیف دہ طرز فکر کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ یہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا المیہ ہے کہ مسلمان جہاں اقلیت میں ہوتے ہیں سیکولرزم کے بڑے مداح ہوتے ہیں۔ وہ اس اصول کی بھی پرزور وکالت کرتے ہیں کہ حکومت اور مملکت تمام شہریوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ لیکن مسلمان جہاں اکثریت میں ہوتے ہیں ان کا رویہ تبدیل ہوجاتا ہے۔ وہاں وہ اسلامی دینی مملکت کے قیام کے بارے میں سوچنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ سن کر تکلیف ہوگی مگر سچ یہی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے سیکولرزم کو اصول کے طور پر قبول نہیں کیا ہے بلکہ اسے پالیسی بنالیا ہے۔ مسلمانوں کے اسی رویئے سے ہندوؤں میں بھی ایسے ترقی پسند عناصر کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے جو ہندو فسطائیت کی بلند ہوتی ہوئی لہروں کا مقابلہ کررہے ہیں۔ ان ترقی پسند ہندوؤں سے خود ان کے فرقے کے اندر بار بار یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ ''کتنے دنوں تک اور کیوں صرف ہندوؤں پر ہی سیکولر ہونا لازم رہے گا۔'' مسلمانوں کو اس کا اچھی طرح سے اندازہ ہونا چاہئے کہ سیکولرزم کی لڑائی ٹکڑوں ٹکڑوں میں نہیں لڑی جاسکتی۔ پوری دنیا کو سیکولر، آزاد خیال اور رواداربنانے کی ضرورت ہے۔ ہماری دنیا میں اسلامی اور غیر اسلامی دونوں طرح کے معاشرے ہیں۔ اکیسویں صدی کے ان ابتدائی دنوں میں بھی اسلامی مملکت کے

قیام کا خواب دیکھنا غیر عملی ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔

''شہر میں کرفیو'' ایک مختصر ناول ہے مگر اس کو ضبط تحریر میں لاتے وقت مجھے بڑی پریشانیوں سے گذرنا پڑا۔ اس کے بہت سے کردار اور واقعات الہ آباد شہر کے ایک چھوٹے سے مضافاتی محلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 1980 کے فسادات کے دوران میں ان لوگوں اور ان کے محلے سے واقف ہوا تھا۔ ان کا دکھ اتنا شدید تھا کہ اس کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا پھر بھی مجھے بار بار یہ محسوس ہوا کہ اس درد کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ میرے ذہن سے پھسلے جا رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا اس کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بلا شبہ یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ زبان، افکار کا ناقص متبادل ہے۔ اب یہ ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر یہ کتاب ایک بھی قاری کو سعیدہ اور دیوی لالہ کا دکھ محسوس کرنے کا اہل بناتی ہے یا کسی ایسی دنیا کا خواب دیکھنے کی تحریک دیتی ہے جس میں کوئی فساد برپا نہ ہوتا ہو، یا اس کے ذریعے فساد برپا کرنے والے عناصر کے لیے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔
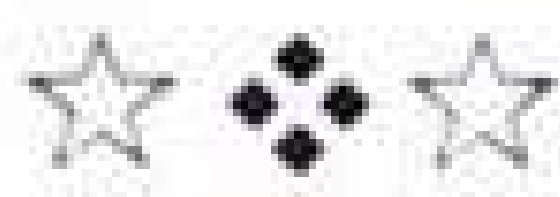
فرقہ وارانہ فسادات میں
پولیس کی جانب داریوں کو بے نقاب کرنے والی

وِبھوتی نارائن رائے

کی تحقیقی دستاویز

فرقہ وارانہ فسادات
اور
ہندوستانی پولیس

قیمت -/100 روپے

ہم سے طلب کریں:

خبردار پبلیکیشنز

2724/10 میٹروپول مارکیٹ، موتی محل اسٹریٹ، دریا گنج نئی دہلی ۔ 110002

فون رفیکس: 23254644

اعلیٰ پولیس افسر اور منفرد ہندی ادیب وبھوتی نراین رائے 28 نومبر 1950 کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1971 میں الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا اور 1975 میں انڈین پولیس سروس (.I.P.S) کے لیے منتخب ہوئے۔ پولیس کی ملازمت کے دوران انھیں اتر پردیش کے فرقہ وارانہ طور پر کئی حساس شہروں میں بطور ایس ایس پی تعیناتی ملی، جہاں انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات کے المیہ کو قریب سے دیکھا۔ ''شہر میں کرفیو'' درحقیقت ان ہی تجربات کا نچوڑ ہے۔ جو ہندوستان کی تمام اہم زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

ایس وی پی نیشنل پولیس اکیڈمی حیدرآباد کے اولین پولیس فیلو کی حیثیت سے انھوں نے ''فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس کی غیر جانبداری کا تصور'' کے موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے جو ایک مستقل کتاب کی صورت میں انگریزی اور ہندی کے علاوہ اردو میں ''فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

ان کے کئی دیگر ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں، جن میں ''گھر'' ''قصہ لوک تنتر'' اور ''تبادلہ'' کے علاوہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''ایک چھاتر نیتا کا روزنامچہ'' قابلِ ذکر ہیں۔ وہ الہ آباد سے شائع ہونے والے ہندی کے ادبی رسالے ''ورتمان ساہتیہ'' کے مدیر ہیں۔ ہندی اور انگریزی کے علاوہ انھوں نے اردو ادب میں بھی نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔

معصوم مرادآبادی

KHABARDAAR PUBLICATIONS

2724/10 Metropol Market, Behind Moti Mahal, Darya Ganj,
New Delhi-110002 Telefax: (011) 23254644